جلد سوم

افادات

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

مرتب

محمد زبیر

مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

فیضانِ معرفت

جلدِ سوم

افادات

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی ومہتمم الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم بنگلور

وخلیفہ حضرت اقدس شاہ مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور

مرتب محمد زبیر استاذ الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم بنگلور

مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

مکتبہ مسیح الامت

نام کتاب : **فیضانِ معرفت** جلدِ سوم

افادات : **حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی** دامت برکاتہم

بانی و مہتمم الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم ، بنگلور

و خلیفہ حضرت اقدس شاہ مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور

مرتب : **محمد زبیر** استاذ الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم ، بنگلور

صفحات : ۲۳۴

تاریخ طباعت : شوال المکرم ۱۴۳۵ھ

ناشر : **مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور**

موبائل نمبر : 09634830797 / 09036701512

ای میل : maktabahmaseehulummat@gmail.com

اجمالی فہرست

فہرستِ مضامین

عناوین | **صفحہ**

اللہ تعالیٰ کی محبت کیسے ملتی ہے؟

''انسانی دل ایک کمپیوٹر ہے''

ایک حدیث کی جدید اور انوکھی تشریح

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اُسوۂ حسنہ ہے

معرفتِ الٰہی اور اس کے آثار

شیطانی حربے

اللہ تعالیٰ ہی کو مقصود بنایئے

نماز کو نماز کیسے بنائیں؟

بیعت کیا اور کیوں؟

"اطاعت" مومن کی حیات ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لأ هله والصلوة لأهلها:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے، اسی مقصدِ خداوندی کی تبلیغ کے لیے انبیائے کرام کا مبارک سلسلہ جاری ہوا، جو امام الانبیا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس عظیم کام کو حضراتِ اہلِ علم اور بالخصوص اولیائے عظام نے سنبھالا اور انھوں نے تصنیف وتالیف، درس وتدریس، وعظ ونصیحت کے ذریعے امت تک اس امانت کو امانت داری کے ساتھ بحسن وخوبی پہنچایا۔ ان صلحا واولیا کی صحبتیں اور مجلسیں انسانوں کے دلوں کو معرفتِ الٰہی ومحبتِ الٰہی کے نور سے منور کرنے میں ہر زمانے میں مؤثر رہی ہیں۔

اسی سلسلۂ عالیہ کی کیمیا اثری کا نمونہ ''مربی ومرشدی فداہ ابی وامی حضرت اقدس دامت برکاتہم ہیں'' اور ویران دل کے تاروں کو چھونے والی آپ کی نورانی مجالس وملفوظات ہیں، جس کے مجموعے ''فیضان معرفت'' کی جلد اول ودوم کو اللہ تعالیٰ نے بے پناہ مقبولیت عطا فرمائی اور الحمدللہ سالکینِ طریقت کو اس سے بہت فائدہ پہنچا، جس کی وجہ سے بہت سارے احباب تیسری جلد کے منتظر تھے۔

اب اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اساتذۂ کرام کی محنتوں اور دعاوں کے نتیجے میں

بندے کو جلدِ سوم کی ترتیب کی سعادت ملی۔ ان مجالس کے مجموعے کی ایک خوبی یہ ہے کہ حضرتِ والا اس پر از اول تا آخر نظر فرماتے ہیں اور نہایت مفید اضافے فرما کر ترتیب کی خامی کی وجہ سے پیدا شدہ مضامین کی تشنگی کو دور فرماتے ہیں؛ نیز اپنے قیمتی مشوروں سے نواز کر احقر کی ہمت افزائی فرماتے ہیں، اسی ہمت افزائی کا نتیجہ ہے کہ مجالس کی ترتیب کا سلسلہ آگے بڑھ رہا ہے۔

اخیر میں میں "حافظ سید محمد صہیب" متعلم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم اور "حافظ و مولوی حبیب الرحمٰن صاحب" نائب امام مسجدِ بید کا ممنون و مشکور ہوں کہ انھوں نے مجالس کی ترتیب کے سلسلے میں میرا بھرپور تعاون فرمایا، جس کے لیے میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اجرِ عظیم عطا فرمائے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ پہلی اور دوسری جلد کی طرح تیسری جلد کو بھی مقبولیت عطا فرمائے اور ان مجالس کی ترتیب کے سلسلے کو مزید آگے بڑھانے کی توفیق عطا فرمائے اور امت کو نفع پہنچائے اور میرے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے اور حضرت اقدس دامت برکاتہم کا سایہ ہم پر تا دیر با عافیت قائم و دائم رکھے تاکہ ہم آپ کے علومِ ظاہری و باطنی سے اور آپ کے مواعظِ حسنہ سے اور آپ کی صحبتوں سے فیض یاب ہوتے رہیں۔

محمد زبیر — استاذ الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم ربنگلور

۱۵؍ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ

اللہ تعالیٰ کی
محبت کیسے ملتی
ہے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ تعالیٰ کی محبت کیسے ملتی ہے؟

الحمد للّٰه وكفىٰ وسلام علىٰ عباده الذين اصطفىٰ أما بعد

فقد قال النبي صلی اللہ علیہ وسلم قال اللّٰه تعالىٰ:وجبت محبتي للمتحابين فيَّ و المتجالسين فيَّ والمتزاورين فيَّ والمتباذلين فيَّ . أو كما قال عليه الصلاة والسلام (مؤطا إمام مالک :۱۷۴۸، مسند أحمد: ۲۲۶۵۱)

میں نے ایک حدیثِ قدسی آپ کے سامنے پڑھی ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خبر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: میری محبت واجب ہوگئی ان لوگوں کے لیے، جو میرے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے بھی میری محبت واجب ہوگئی، ضروری ہوگئی، جو میری محبت کی خاطر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے اٹھتے ہیں اور ان کے لیے بھی میری محبت واجب ہوگئی، جو میری محبت کی خاطر ایک دوسرے کی زیارت کرتے ہیں اور آخری جملے میں فرماتے ہیں کہ ان لوگوں کے لیے بھی میری محبت واجب ہوگئی، جو میری ہی محبت کی خاطر مال و دولت خرچ کرتے ہیں۔

یہ حدیث ایک عجیب قسم کی حدیث ہے، اس میں اللہ تعالیٰ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ میری محبت کیسے ملتی ہے اور کب ملتی ہے۔

جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

سن لے اے دوست! جب ایام بھلے آتے ہیں
گھات ملنے کی وہ خود آپ ہی بتلاتے ہیں

اللہ اکبر! جب اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتے ہیں اور اس کا اچھا وقت آجاتا ہے، تو خود وہی بتاتے ہیں کہ کیسے ملنا ہے ہم سے؟ کہاں ملنا ہے ہم سے؟ اور ملنے کی راہ کیا ہے؟ یہ سب باتیں وہ خود ہی بتلا دیتے ہیں اور اگر کسی کے ایام بھلے نہیں آتے، تو آدمی ٹکروں پر ٹکریں کھاتا رہتا ہے، نماز بھی جاری، ذکر بھی جاری، تلاوت بھی جاری، سب جاری اور دوسری طرف سے فضیحت بھی جاری، اس لیے کہ اس کا بھلا وقت نہیں آیا۔

شیطان نے بہت سجدے مارے؛ لیکن کیا اس کا کوئی سجدہ اس کے کام آیا؟ بہت سجدے کیے؛ یہاں تک کہ بعض علما لکھتے ہیں کہ زمین کا کوئی چپہ ایسا نہیں جہاں اس نے سجدہ نہ کیا ہو، چپے چپے پر اس کا سجدہ؛ لیکن اس کا سجدہ اسے کچھ بھی کام نہیں آیا کیوں؟ اس لیے کہ اس کے لیے بھلے ایام آئے ہی نہیں۔

اب دیکھیے کہ اللہ نے اپنی محبت کے حصول کا کیا پتہ دیا ہے؟ اس حدیث میں کُل چار قسم کے لوگوں کا ذکر ہے، جن کو اللہ اپنی محبت عطا فرماتے ہیں، ایک: ''وہ جو ایک دوسرے سے اللہ کے لیے محبت کرتے ہیں''، دوسرے: ''وہ جو اللہ کی خاطر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے اٹھتے ہیں''، تیسرے: ''وہ جو اللہ کی خاطر ایک دوسرے کی زیارت کرتے ہیں'' اور چوتھے: ''وہ جو اللہ کے لیے مال و دولت خرچ کرتے ہیں''۔

اور یہ چار الگ الگ قسم کے لوگ نہیں ہیں؛ بل کہ یہ چار وہ ہیں، جن کے اندر یہ چاروں صفات یکجا ملتی ہیں، گویا کہ یہ چاروں کی چاروں صفات ایک ہی ذات کے اندر ملتی ہیں، اس لیے کہ وہ آپس میں لازم ملزوم ہیں، ایک کے بغیر دوسرے کا وجود نہیں اور جب ایک پایا جائے، تو دوسرے کے نہ پائے جانے کا کوئی سوال نہیں؛ لہٰذا اس حدیث سے یہ سمجھ میں آیا کہ اللہ کی محبت ان لوگوں کو ملتی ہے، جن کے

اندر یہ چار صفات موجود ہوں؛ لہٰذا اللہ کی محبت کا پتہ یہ ہے کہ ان چار صفات کو پالیں، جس کو یہ چار صفات مل گئیں اس کو اللہ کی محبت مل گئی۔

ہر ایک اللہ کی محبت کا خواہاں ہے

بھائیو! ہم میں کون ایسا ہے، جو یہ نہ چاہتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اسے ملے؟ سب چاہتے ہیں کہ اللہ کی محبت ہم کو مل جائے، ہر آدمی کی آرزو ہے، جستجو ہے، تلاش ہے، تمنا ہے، خواہش ہے کہ اللہ کی محبت ملے، حتیٰ کہ جو لوگ گناہوں میں ملوث ہیں، وہ لوگ بھی چاہتے ہیں کہ ان کو اللہ کی محبت حاصل ہو، آپ کسی شرابی سے پوچھ کر دیکھیے اور کسی زنا کار سے پوچھ کر دیکھیے، کسی فاسق اور فاجر سے پوچھ کر دیکھیے؛ بل کہ کافر سے پوچھ کر دیکھیے، وہ بھی اللہ کی محبت چاہتا ہے۔ یہ ایسی چیز ہے کہ اس چیز کی الفت اور محبت خدا نے سب کے دلوں میں ڈال رکھی ہے، اسی لیے اللہ کی معرفت انسان کی طبعی خواہش ہے، اللہ سے محبت انسان کی فطری آرزو ہے۔

جو مضطرب ہے، اس کو اِدھر التفات ہے
آخر خدا کے نام میں کوئی تو بات ہے؟!!

یہ الگ بات ہے کہ اسے شیطان بھٹکا بھٹکا کر غلط راہوں پر ڈالتا ہے، جس کی وجہ سے وہ اس میں کام یاب نہیں ہوتا؛ لیکن جہاں تک مسئلہ ہے نفس کی خواہش کا، تو وہ ہر انسان کے دل میں ہے کہ اللہ کی محبت چاہیے اور اللہ کی معرفت چاہیے۔

پہلی صفت۔ ''اللہ والوں سے محبت''

اب دیکھیے کہ اللہ کی محبت کن کن کو ملتی ہے؟ اس حدیث میں اللہ کے نبی ﷺ نے سب سے پہلے فرمایا کہ ''وجبت محبتي للمتحابين

فِيَّ'' کہ اللہ کی محبت ایک تو ان کو ملتی ہے، جو اللہ کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔

یہ بات بہت واضح ہے کہ اللہ کے لیے محبت اسی آدمی سے ہوسکتی ہے، جو اللہ کا محبوب ولاڈلا ہے؛ ورنہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ مثلاً کسی کافر سے محبت کریں اور کہیں کہ میں اللہ کے لیے ایک کافر سے محبت رکھتا ہوں؟ کسی فاجر سے، کافر سے اور کسی غلط کار انسان سے آپ محبت کریں اور پھر یہ دعویٰ کریں کہ میں اس آدمی سے جو محبت کررہا ہوں، وہ محض اللہ کی محبت کے لیے ہے، تو یہ بات حدیث کے منشا کے خلاف ہے اور اس دعوے کے اندر کوئی واقعیت اور کوئی حقیقت نہیں۔

اس لیے یہاں لامحالہ مراد یہ ہے کہ اللہ سے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں؛ یعنی نیک لوگوں سے محبت کرتے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد اولیاء اللہ کی اور نیک لوگوں کی محبت ہے۔

دوسری بات اس میں سمجھنے کی یہ ہے کہ ''متحابین'' عربی پڑھنے والے جانتے ہیں کہ یہ '' تحابب'' سے بنا ہے اور اس میں اشتراک پایا جاتا ہے؛ اس لیے اس کا ترجمہ ہے '' آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرنا'' لہٰذا ''متحابین'' دو قسم کے لوگ ہوں گے: ایک محبت کرنے والے ہوں گے اور ایک وہ ہوں گے، جن سے محبت کی جائے، اسی وقت ''متحابین'' کا اطلاق صحیح ہوتا ہے، تو اب مطلب یہ ہوا کہ کچھ لوگ محض اللہ کی محبت میں اللہ کے محبوب بندوں سے محبت کریں گے اور دوسرے وہ لوگ، جو اللہ کے محبوب ہیں، وہ بھی ان لوگوں سے اس لیے محبت کریں گے کہ یہ اللہ کو چاہتے ہیں اور اللہ کی محبت حاصل کرنے ان کی خدمت میں آئے ہیں، ادھر سے بھی محبت کا تحقق ہو، ادھر سے بھی محبت کا تحقق ہو، جب دونوں

طرف سے تحقق محبت کا ہوا، تو اشتراک ہو گیا۔

لہٰذا اولیا اللہ کی خدمت میں جانا ہے؛ کیوں ان سے محبت رکھنا ہے؟ کیوں ان سے تعلق رکھنا ہے؟ اس لیے کہ ان سے محبت کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ اپنی محبت ضرور بالضرور دیتے ہیں۔

ان سے ملنے کی ہے یہی یک راہ ہے
کہ ملنے والوں سے راہ پیدا کر

ارے جناب! اگر آپ اللہ کو چاہتے ہیں، تو انھیں لوگوں کے پاس تو جائیں گے، جن کے پاس اللہ ملے گا۔ چاول خریدنے انھیں کے پاس تو جائیں گے، جن کے پاس چاول ملے گا، سونا خریدنے انھیں کے پاس تو جائیں گے، جن کے پاس سونا ملے گا؛ اگر کسی آدمی کو سونا چاہیے اور وہ چلا گیا لوہار کے پاس، تو اسے کبھی بھی سونا نہیں ملے گا۔ اسی طرح کافر کے پاس کفر ملے گا، فاسق کے پاس فِسق ملے گا، خدا کی محبت نہیں ملے گی، جن کے پاس خدا کی محبت ہے، وہ ہیں اولیا اللہ، ان کے دلوں کے اندر، جو خدا کی محبت ہے، اس کو پانے کے لیے ان سے محبت کیجیے۔ یہ ہے حاصل اس حدیثِ پاک کا۔

اللہ کے لیے محبت کرنے والوں کا مقام

ایک حدیث میں ہے، اللہ کے نبی صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ اللہ فرماتے ہیں: ''أَلْمُتَحَابُّوْنَ فِي جَلَالِي لَهُمْ مَنَابِرُ مِنْ نُوْرٍ يَغْبِطُهُمُ النَّبِيُّوْنَ وَ الشُّهَدَاءُ'' (جو لوگ میرے جلال کی وجہ سے ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہیں، ان کے لیے قیامت کے دن نور کے ممبر بچھائے جائیں گے اور ان کو دیکھ کر انبیا اور شہدا بھی رشک کریں گے)۔ (ترمذي: ۲/۶۴، مسند أحمد: ۲۲۰۸۰)

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم دعاؤں میں مسلسل ایک دعا یہ بھی کرتے تھے: **أَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِي حُبَّکَ وَحُبَّ مَنْ يَّنْفَعُنِيْ حُبُّهٗ عِنْدَکَ.**

(اے اللہ! مجھے تیری محبت عطا فرما اور اس شخص کی بھی محبت عطا فرما، جس کی محبت تیرے نزدیک کام آنے والی ہے) (ترمذي: ۲/۱۸۷)

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم دعا میں کہہ رہے ہیں: ''اے اللہ! اس شخص کی بھی محبت عطا فرما، جس کی محبت تیرے پاس مجھے کام آنے والی ہے''۔ سب سے بڑے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، ان سے بڑا تو کوئی نہیں؛ حتیٰ کہ انبیاء بھی نہیں، آپ سردارِ انبیاء ہیں، آپ سید الاولین والآخرین ہیں، آپ سید الکائنات ہیں، آپ سید الانبیا ہیں، سید المرسلین ہیں، آپ امام الانبیا ہیں، آپ سے بڑا تو کوئی نہیں، اس کے باوجود یہ دعا مانگنا دراصل ہمیں اور آپ کو اللہ والوں کا مقام بتانے اور سمجھانے کے لیے ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ والوں کی محبت مطلوب عندالشرع ہے اور دوسری بات یہ بھی سمجھ میں آئی کہ اللہ کے ولیوں سے محبت رکھیں گے، تو اللہ کے نزدیک وہ کام بھی آئے گی، کبھی ان کی سفارش ہو جائے گی، کبھی ان کی دعا لگ جائے گی۔

بعض بزرگانِ دین نے ایک عجیب بات فرمائی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے محبوب بندوں کے دلوں میں جھانکتے ہیں اور ان کے دلوں میں جن جن کی محبت ہوتی ہے، ان کو بھی مقبول بنا دیتے ہیں۔

اللہ اکبر! گویا اللہ تعالیٰ کہتے ہیں: ''یہ میرے بندے کا دل ہے اور اس دل میں

دیکھو فلاں فلاں بیٹھے ہوئے ہیں یعنی یہ بندہ ان بندوں سے محبت کرتا ہے، جب ان سے یہ بندہ محبت کرتا ہے، تو پھر میں ان کو بھی قبول کر لیتا ہوں''۔

اہل اللہ کے جلیس محروم نہیں ہوتے

اسی لیے عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جو اولیا اللہ سے تعلق رکھنے والے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو ہمیشہ محفوظ و مامون رکھتا ہے، جو اولیا اللہ سے محبت کے ساتھ دین سیکھتے ہیں، اولیا اللہ کی سرپرستی میں عمل سیکھتے ہیں؛ بل کہ یوں کہنا چاہیے کہ دین پر چلنا انگلی پکڑ پکڑ کر سیکھتے ہیں، جیسے بچہ اپنے باپ کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھتا ہے، تو ان شاء اللہ اللہ تعالیٰ ان کو کفر سے، شرک سے، بدعت سے، ضلالت و گمراہی سے محفوظ و مامون رکھیں گے۔

ایک حدیث ذہن میں آگئی، وہ یہ کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ایک طویل حدیث میں فرمایا کہ اللہ کے فرشتے راستوں میں ذاکرین کو تلاش کرتے رہتے ہیں، جب وہ اللہ کے پاس جاتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ ان سے اہلِ ذکر کے بارے میں پوچھتے ہیں؛ پھر فرماتے ہیں کہ ''تم گواہ رہنا کہ میں نے ان کی مغفرت کر دی''، تو ایک فرشتہ کہتا ہے کہ اے اللہ! ان میں ایک شخص ایسا بھی تھا، جو ذکر کے لیے نہیں؛ بل کہ اپنی کسی حاجت کی وجہ سے وہاں آیا تھا، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ''هُمُ الْجُلَسَاءُ لَايَشْقٰى بِهِمْ جَلِيْسُهُمْ'' (یہ اہلِ ذکر وہ لوگ ہیں کہ ان کے پاس بیٹھنے والا بھی محروم نہیں ہے) (بخاري: ٦٤٠٨، صحيح ابن حبان: ٣/١٣٥)

اولیا اللہ سے محبت و تعلق کا فائدہ - امام رازی رَحِمَہُ اللّٰہُ کا واقعہ

اولیا اللہ سے تعلق و محبت رکھنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی وجہ سے ہمیں نواز دیتے ہیں اور ایمان محفوظ رہتا ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ امام

رازی رحمہ اللہ ایک جلیل القدر عالم، فاضل، مفسر اور اسی کے ساتھ ساتھ آپ بہت بڑے فلسفی، منطقی تھے، آپ نے محبتِ خداوندی کی خاطر ایک اللہ والے سے بیعت کی، شیخ نے اذکار و وظائف بتائے رات میں اٹھ کر تہجد پڑھنے کو کہا، ذکر کرنے کا حکم دیا۔ امام رازی رحمہ اللہ حکم کے مطابق جب ذکر کے لیے رات میں بیٹھتے، تو ان کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کے اندر سے ایک دھواں نکل رہا ہے، انھوں نے چند دن تو دیکھا، اس کے بعد اپنے شیخ کے پاس جا کر شکایت کی کہ حضرت! میں ذکر کرتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے دل کے اندر ایک آگ ہے، اس کا دھواں نکل کر میرے منہ سے باہر جا رہا ہے۔

شیخ نے کہا کہ یہ اللہ کی محبت کی آگ ہے، جو دل میں لگ رہی ہے اور تمہارے فلسفے اور منطق کے علوم کو جلا رہی ہے، اسی کا یہ دھواں ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ کو یہ سن کر بڑا افسوس ہوا؛ اس لیے کہ ان علوم کے پیچھے تو عمر لگائی تھی، زندگی کھپائی تھی، بڑا پیسہ خرچ کیا تھا، رات رات جاگتے رہے تھے، اپنا سارا آرام اور عیش اس کے پیچھے گنوا ڈالا تھا؛ یہاں تک کہ دنیا میں منطقیوں اور فلسفیوں کے امام قرار پائے، تو امام رازی رحمہ اللہ نے کہا کہ اتنا سارا علم، جو میں نے اتنی محنت اور مجاہدے سے حاصل کیا ہے، اگر وہ جل کر خاک ہو جاتا ہے، تو یہ مجھے منظور نہیں ہے؛ اس لیے واپس چلے آئے؛ لیکن آگ تو اندر لگ چکی تھی، وہ ایک چنگاری کی شکل میں اندر دبی رہی، زمانہ گزرتا رہا، گزرتا رہا؛ پھر ایک وقت وہ آیا، جو ہر انسان کے لیے اللہ نے مقدر کر رکھا ہے؛ یعنی موت کا وقت۔ موت کے وقت شیطان بہکانے کے لیے آیا اور اس نے امام رازی رحمہ اللہ سے بحث شروع کر دی کہ تم اللہ کو ایک مانتے ہو؟ بتاؤ کیا دلیل ہے؟ امام رازی رحمہ اللہ نے اپنے دماغ سے ایک سو دلیلیں اللہ کی وحدانیت پر فلسفیانہ، منطقیانہ تیار کی تھیں۔

امام رازی رحمہ اللہ نے دلیل پیش کی؛ لیکن شیطان تو ان سے بھی بڑا فلسفی تھا، اس نے اس دلیل میں نقص وعیب نکال دیا، امام رازی نے کہا کہ یہ دلیل چھوڑ و، دوسری لو! اس نے اس دلیل میں بھی کوئی کسر نکال دی، انھوں نے تیسری دلیل پیش کی، شیطان نے اس کے اندر بھی کوئی کھوٹ نکال دیا۔ یہ سلسلہ چلتا رہا، یہاں تک کہ انھوں نے ننانوے دلیلیں پیش کیں اور اس نے سب کو توڑ دیا۔ اب روح قبض ہونے والی ہے، شیطان ادھر بہکانے میں مشغول ہے، اسی وقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے شیخ کو الہام کیا، وہ اس وقت وضو کر رہے تھے، ان کے قلب پر الہام ہوا کہ تمہارے وہ مرید جو آئے تھے تمہارے پاس اور تم نے میری محبت کی آگ ان کے دل میں لگا دی تھی؛ لیکن وہ پھر بھی واپس ہو گئے تھے۔ آگ لگ جانے کے بعد میں کسی کو محروم نہیں کیا کرتا، ذرا ان کی طرف آپ توجہ کریں۔ امام رازی رحمہ اللہ کی وہ گفتگو جو شیطان کے ساتھ چل رہی تھی، اللہ نے اِن بزرگ کو پہنچا دی، شیخ کو آواز آئی اور وہ سن رہے تھے، شیخ نے کہا کہ یہ کیا بحث ومباحثہ میں مبتلا ہو؟ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ میں بے دلیل خدا کو ایک مانتا ہوں۔ یہ دلیل، وہ دلیل، یہ کیا دلیلیں ہیں؟ اللہ نے کہہ دیا کافی ہے ہمارے لیے، اب کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ امام رازی رحمہ اللہ کو اللہ نے شیخ کی آواز سنائی، شیخ کی وہ آواز کان میں آتے ہی امام رازی کی زبان سے نکلا کہ میں بے دلیل خدا کو ایک مانتا ہوں۔ جب یہ کہا، تو اسی وقت ان کی روح قبض ہو گئی اور شیطان بھاگ گیا۔

معلوم ہوا کہ جو اس راستے پر چل پڑا، جو اس راستے میں داخلہ لے لیا، وہ کبھی محروم نہیں ہوگا، اللہ کبھی نہ کبھی اس کو پہنچا ہی دیتے ہیں۔

اللہ کے ولی کا ادب کرنے پر مغفرت

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا واقعہ

بزرگوں کے واقعات میں لکھا ہے کہ امام احمد ابن حنبل رحمہ اللہ کے زمانے میں ایک شخص کا انتقال ہوا، کسی کے خواب میں وہ شخص آیا، تو اس نے پوچھا کہ بھائی! تیرے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کیا معاملہ ہوا؟ تو اس نے کہا کہ اللہ کے فضل سے میری مغفرت ہوگئی۔ پوچھا کہ کس بنیاد پر مغفرت ہوئی؟ کہا کہ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ مجھے وضو کرنے کی ضرورت پڑی، تو میں وضو کرنے کے لیے ایک نہر کے کنارے پہنچا، میں نے دیکھا کہ نیچے کی طرف امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ بیٹھ کر وضو کر رہے ہیں، تو میں نے یہ خیال کیا کہ وہ وہاں وضو کر رہے ہیں، مجھے بھی وضو کرنا ہے، اگر میں یہاں بیٹھ کر وضو کروں گا، تو میرا غسالہ (اعضا کا دھویا ہوا پانی) ان کی طرف جائے گا اور ان کے وضو کے پانی میں ملے گا، یہ ادب کے خلاف ہے؛ اس لیے مجھے وہ جہاں بیٹھے ہیں، اس سے نیچے بیٹھ کر وضو کرنا چاہیے؛ یہ سوچ کر میں وہاں سے اٹھا اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ جہاں بیٹھے تھے، اس کے نیچے جا کر میں نے وضو کیا تاکہ ان کا غسالہ میری طرف آئے گا، تو مجھے بھی کچھ تبرک حاصل ہوگا۔ کہتے ہیں کہ اس ادب پر میری بخشش ہوگئی۔

اس واقعے میں غور کیجیے کہ اللہ والے کا ایک معمولی ادب کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مغفرت جیسی عظیم دولت عطا فرما دی، جو شخص ہمیشہ ان کی اتباع کرے، تو اسے کیا کچھ اللہ تعالیٰ نہیں دیں گے؟!! اسی لیے بخاری کی ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "هُمْ قَوْمٌ لَا يَشْقٰى جَلِيْسُهُمْ" کہ

یہ اولیا اللہ کی قوم وہ قوم ہے کہ ان کے پاس بیٹھنے والا کبھی محروم نہیں ہوتا۔
(بخاری: ٦٤٠٨)

دوسری صفت-''مجالست''

آگے حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اللہ کی محبت پانے والوں کی دوسری صفت بیان کی کہ ''والمتجالسین فیَّ''(جو میرے لیے مصاحبت اور مجالست اختیار کرتے ہیں، ان کے لیے بھی میری محبت واجب ہوگئی)

مجالست ومصاحبت کیا ہے؟ کہ نیک لوگوں کی صحبت ومعیت میں رہا جائے، ان کے ساتھ اٹھنا، بیٹھنا ہو۔ اس حدیث میں مجالست پر اللہ کی محبت دیے جانے کا ذکر ہے کہ جو اللہ والوں کے پاس اٹھتا، بیٹھتا ہو؛ اس کے لیے بھی اللہ کی محبت واجب ہوگئی۔

اے اللہ کو چاہنے والو! اگر تم واقعۃً اللہ کے طالب ہو، تو جاؤ اہل اللہ کی صحبت اختیار کرو! اس سے اللہ کی محبت تم میں بھی منتقل ہو جائے گی۔

کیسے؟ سنو کہ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''نیک لوگوں کی صحبت کی مثال ایسی ہے، جیسے کوئی عطار (عطر بیچنے والا) ہو اور آدمی اس کے پاس پہنچے، تو جب تک اس کے پاس رہے گا، ہوسکتا ہے کہ وہ خود اسے عطر لگا دے، عطر پیش کر دے، اگر نہیں، تو کم از کم جب تک وہاں بیٹھا رہے گا، اس کا دل ودماغ عطر کی خوشبوؤں سے معطر ہوتا رہے گا اور فرمایا کہ بُری صحبت کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی آدمی کسی لوہار کے پاس اس کی بھٹی میں جا کر بیٹھ جائے، جب تک وہاں بیٹھے گا، یا تو یہ ہوگا کہ اس کے کپڑے جلیں گے، کہیں چنگاریاں آئیں گی، اس کو جلائیں گی، اگر یہ نہیں ہوگا، تو کم از کم، کم از کم وہاں کے دُھوئیں سے اس کا دماغ مکدر ہو جائے گا۔ (بخاری: ۱/ ۲۸۲، مسلم: ۲/ ۳۳۰)

اسی طرح نیک صحبت میں جب بیٹھے گا، اللہ کے ولیوں کی صحبت میں بیٹھے گا، نیک کردار لوگوں کی صحبت میں بیٹھے گا، تو وہاں اللہ تبارک وتعالی کا ذکر ہوتا رہے گا، رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ذکر ہوتا رہے گا، دین کا ذکر ہوتا رہے گا، دین کی فکر ہوتی رہے گی، دل ودماغ اس کی وجہ سے معطر ہو جائے گا اور جب تک ان کے ساتھ بیٹھے گا دماغ کے اندر صالح تبدیلیاں بھی شروع ہو جائیں گی؛ اگر طبیعت میں ایسی تبدیلی پیدا ہوگئی، جو پائے دار ہو، تو پھر بیڑہ پار ہو جائے گا اور اگر ایسا نہ بھی ہوا، تو جب تک بیٹھے گا اس وقت تک تو یہ ہوگا کہ اس کے دل میں نیکی کا جذبہ و خیال ، آخرت کی فکر و تڑپ پیدا ہو جائے گی۔ اسی بات کو رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ایک عمدہ مثال سے سمجھا دیا ہے۔

معلوم ہوا کہ نیک صحبت بہت ضروری ہے، نیک لوگوں کی مجلس کا اثر ضرور مرتب ہوتا ہے، دنیا کے اندر آپ دیکھ لیجیے، بڑی مجلسیں ہوتی ہیں، بُری بھی ہوتی ہیں اور اچھی بھی ہیں، مختلف قسم کی ہیں، دنیوی بھی ہیں، دینی بھی ہیں۔ ہر مجلس کا رنگ الگ ہوتا ہے، ہر مجلس کا اثر الگ ہوتا ہے، ہر مجلس کی کیفیت الگ ہوتی ہے؛ یہ اس لیے کہ یہ بات طے شدہ ہے کہ مجالس وصحبتوں کا اثر ضرور ہوتا ہے اور مجالس کا اثر صاحبِ مجلس کی وجہ سے ہوتا ہے۔

خود قرآنِ کریم نے بھی اس کا حکم دیا ہے: ﴿يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ (اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور صادقین کے ساتھ رہا کرو) (التوبة: ۱۱۹)

اس میں "كُوْنُوْا" فرمایا گیا، اس کے معنی ہیں "رہا کرو" ایک دفعہ رہو نہیں ہے؛ بل کہ اس کے اندر استمرار (بار، بار کسی کام کا ہونا) ہے، ہوسکتا ہے کہ کوئی طالبِ

علم سوال کر بیٹھے کہ اس میں استمرار کہاں سے آیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عربی داں جانتے ہیں کہ امر کا صیغہ مضارع سے بنتا ہے، جب مضارع سے بنتا ہے، تو مضارع کی خصوصیات بھی اس کے اندر رہتی ہیں؛ لہٰذا مضارع میں تجدد بھی ہوتا ہے، مضارع کے اندر استمرار بھی ہوتا ہے، تو امر میں بھی استمرار اور تجدد پایا جائے گا۔

تو "کونوا" کا ترجمہ ہے، اولیا اللہ کے ساتھ مستقل رہا کرو، یہ نہیں کہ ایک دفعہ جا کر پھر اس کے بعد بند کردو۔

مجالس کا اثر مرتب ہونے پر ایک حسی مثال

بھائیو! مجالس کا اثر کس طرح مرتب ہوتا ہے؟ اس کو ایک حسی مثال سے سمجھیے کہ اگر کسی جگہ دو، چار آدمی بیٹھ کر ہنس رہے ہوں، کسی بات پر کوئی تبصرہ انھوں نے کیا، کسی بات کا تذکرہ کیا اور اس میں کسی بات پر ہنسی آ گئی اور سب ہنسنے لگے، اسی ہنسی کے موقعے پر آپ وہاں پہنچ گئے اور وہ لوگ برابر ہنسنے میں مشغول ہوں، تو آپ بتائیے کہ آپ وہاں روئیں گے یا خاموش بیٹھے گے، یا آپ بھی ہنسیں گے؟ ظاہر ہے کہ آپ بھی ضرور ہنسیں گے۔ اب یہاں سوال یہ ہے کہ آپ نے تو کچھ سنا نہیں کہ بات کیا ہے، آپ کو بالکل معلوم نہیں ہے کہ اہلِ مجلس کیوں ہنس رہے ہیں؟ لیکن اس کے باوجود آپ بھی ہنسیں گے۔ یہ ہے اثر کا منتقل ہونا، ان کے ہنسنے کا اثر آپ کے دل پر پڑ رہا ہے اور آپ کو بھی ہنسی آ رہی ہے۔

بالکل اسی طریقے پر ایک جگہ پر چند لوگ بیٹھے ہوئے رو رہے تھے اور آپ کو بالکل خبر نہیں تھی کہ وہ کیوں رو رہے ہیں، اپنی کسی بیماری سے رو رہے ہیں، کسی پریشانی سے رو رہے ہیں، کسی کے مار دینے سے رو رہے ہیں یا اور بھی کوئی بات ہو سکتی ہے۔ اتفاق سے آپ اس مجلس میں پہنچ گئے، تو خود بخود آپ کو بھی رونا آ جائے

گا، بغیر وجہ کے جانے آپ بھی رونا شروع کردیں گے؛ اگر آپ سے پوچھا جائے کہ آپ کیوں رو رہے ہیں؟ آپ کہیں گے کہ مجھے پتہ نہیں ہے! یہ ہے مجلس کا اثر۔

اسی طرح مجالسِ اولیا کے ذریعے سے غیر شعوری طور پر علوم منتقل ہوتے ہیں، معرفت منتقل ہوتی ہے، محبت منتقل ہوتی ہے اور دیگر کیفیاتِ باطنی منتقل ہوتی ہیں، اس کا انکار کرنا بداہت کا انکار ہے، اس کا انکار دن کے اجالے میں سورج کے انکار کے مرادف ہے۔

مجلس کا اثر کیسے ہوتا ہے؟ ایک حکیم صاحب کا واقعہ

حضرت مولانا حکیم الامت اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے ایک مرید تھے، انھوں نے ایک دفعہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے پاس خط لکھا کہ حضرت! میرے اندر غصہ بہت زیادہ ہے، میں یہ چاہتا ہوں کہ میری اصلاح ہوجائے۔ لہٰذا اس کے لیے کوئی نسخہ تجویز فرمادیں۔ وہ صاحب لکھنؤ سے قریب کے رہنے والے تھے۔

حضرت رحمہ اللہ نے ان کو جواب لکھا کہ لکھنؤ میں میرے خلیفہ فلاں حکیم صاحب رہتے ہیں، فلاں جگہ پر ان کا مطب، کلینک (CLINIC) ہے، تم ان سے اجازت لے کر ان کے پاس بیٹھ جایا کرو، وہ تو اپنے کام میں مشغول رہیں گے لیکن تم ان کے پاس جاکر بیٹھ جایا کرو اور یہ بھی لکھا کہ پندرہ دن تک بیٹھنے کے بعد مجھے خط لکھنا کہ کیا اثر ہوا۔

چناں چہ وہ صاحب پتہ تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچے، حکیم صاحب کی کلینک مل گئی اور ان سے ملاقات کی اور کہا کہ حضرت نے مجھے ایسا لکھا ہے کہ میں آپ کی خدمت میں بیٹھا کروں، اگر آپ اجازت دیں، تو یہاں بیٹھ جایا کروں گا۔ انھوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ وہ حکیم صاحب تو اپنے کام میں مشغول رہتے، بیماروں کی نبض

دیکھتے، دوائیاں تجویز کرتے تھے اور یہ صاحب ان کے قریب بیٹھے رہتے تھے۔ پندرہ دن کے بعد انھوں نے حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللہُ کو خط لکھا کہ ''اللہ کا فضل ہے کہ غصہ بالکل کافور ہوگیا''، انھوں نے اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ حضرت! غصہ تو میرا کافور ہوگیا؛ لیکن ایک سوال ذہن میں آگیا ہے کہ حکیم صاحب نے نہ مجھے کچھ کہا اور نہ میں نے ان سے کچھ کہا، صرف ان کے پاس بیٹھنے سے میرا غصہ کیسے ختم ہوگیا؟ یہ فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ حضرت کے پاس خط آیا، تو اس کا جواب لکھا کہ جی! نہ انھوں نے کچھ کہا، نہ تم نے کچھ کہا؛ لیکن ان کے دل میں جو حلم کا مادہ ہے، صحبت کی تاثیر سے وہ منتقل ہوکر تمہارے دل میں آگیا۔

اللہ اکبر! یہ ہے تاثیر صحبتِ اولیا کی؛ لہٰذا یہ نیک لوگوں کی مصاحبت ومجالست بہت ضروری ہے، مجالست ایک ذریعہ ووسیلہ ہے اللہ کی معرفت کو پانے کا، اللہ کی محبت کو پانے کا، اسی کا ذکر مذکورہ حدیث کے اندر کیا گیا ہے۔

تیسری صفت-''اہل اللہ کی زیارت''

اب تیسری صفت سنیے! اس حدیث میں آگے فرمایا کہ: **''والمتزاورین في''** کہ میری محبت ان کے لیے بھی واجب ہوگئی، جو میری خاطر ایک دوسرے کی زیارت کرتے ہیں؛ لہٰذا اللہ کی محبت پانا ہو، تو ایک کام یہ کرنا ہوگا کہ اہل اللہ کی زیارت و ملاقات کی جائے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ ایک شخص نے اپنے ایک مومن بھائی کی زیارت کی، جو دوسرے گاؤں میں رہتا تھا، تو اللہ نے اس کی حفاظت کے لیے ایک فرشتے کو اس کے راستے پر مقرر کردیا، جب وہ شخص چلتے ہوئے اس فرشتے کے قریب سے گزرا، تو فرشتے نے پوچھا کہ کہاں کا ارادہ ہے؟ اس

نے کہا کہ میرے بھائی، جو اس گاؤں میں ہیں، ان کے پاس جانے کا ارادہ ہے۔ فرشتے نے پوچھا کہ کیا تمھاری کوئی اس سے رشتہ داری ہے؟ اس نے کہا نہیں! بل کہ صرف اللہ کے واسطے اس کی زیارت کو جا رہا ہوں، فرشتے نے کہا کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا ہوں، اللہ نے تم کو بتایا ہے کہ اللہ بھی تم سے محبت کرتا ہے، جس طرح تم اللہ کے لیے اس بندے سے محبت کرتے ہو۔ (مسلم: ۶۷۱۴، أحمد: ۹۵۲۹)

بھائیو! جب اللہ کے واسطے اللہ کے محبوب بندوں کی زیارت کی جاتی ہے، تو اللہ خوش ہوتے ہیں اور اس کو اپنی محبت عطا کر دیتے ہیں اور بارگاہِ الٰہی کے مقربین کی زیارت پر صرف آخرت ہی کی نعمتیں نہیں؛ بل کہ دنیا کی نعمتیں بھی ملتی ہیں۔

ایک حدیث میں اس کا ذکر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی بندے کی اللہ کے لیے زیارت کرتا ہے، اس کو ایک منادی پکارتا ہے اور کہتا ہے کہ ''تو خوش رہے اور تیرا سفر (یعنی آخرت کا سفر) بھی آرام سے ہو اور تو جنت میں اپنی منزل بنائے''۔ (ترمذي: ۲۱۳۹)

غور فرمائیے کہ اس میں اللہ کا فرشتہ دین و دنیا دونوں کی بھلائی کی دعا دے رہا ہے کہ تو دنیا میں خوش رہے اور آخرت کا سفر بھی آرام سے ہو اور جنت میں منزل بھی بنا لے۔ یہ کس بات پر دعا دی جاتی ہے؟ اللہ کے نیک بندوں کی زیارت کرنے پر، معلوم ہوا کہ اللہ کے نیک بندوں کی زیارت و ملاقات کے لیے جانا چاہیے، یہ کام بہت بہترین کام ہے۔

مگر آج کل لوگوں میں اس کا رواج ہی ختم ہو گیا کہ اللہ والوں کی ملاقات و زیارت کی خاطر سفر کریں، ان کے مقام پر پہنچ کر ان سے استفادہ کریں؛ بل کہ اب کوئی بزرگ آجاتے ہیں، تو لوگ بھیڑ کر کے ان کو دیکھ لیتے ہیں اور وہ بھی ان کو

تکلیف واذیت پہنچا کر دیکھ لیتے ہیں، مصافحے کے لیے ایک دوسرے پر تشدد کرتے ہیں، خود ان کو بھی تکلیف دیتے ہیں۔ یہ زیارت کوئی زیارت نہیں، ادب کے ساتھ ان کے پاس جائیے، اگر دور ہوں تو سفر کیجیے۔

چوتھی صفت: ''اہل اللہ پر خرچ''

اب ایک صفت آخری رہ گئی، جس پر اللہ کی جانب سے محبت عطا ہوتی ہے اور اس کا ذکر اس جملے میں کیا گیا ہے: '' **والمتباذلین فيَّ** '' کہ میری محبت ان کے لیے بھی واجب ہوگئی، جو ایک دوسرے پر محض میرے واسطے خرچ کرتے ہیں؛ لہٰذا اللہ کی محبت پانا ہو، تو اللہ کے راستے میں اللہ کی خاطر خرچ بھی کرنا چاہیے۔ اس میں مدارس و دینی کاموں پر خرچ بھی داخل ہے؛ کیوں کہ دین پر اور اہلِ دین پر خرچ اللہ ہی کے لیے ہوتا ہے، اس کا اور کوئی مقصد نہیں اور نہ ہونا چاہیے؛ لہٰذا تمام دینی خدمات و کاموں پر، خواہ وہ مدارس ہوں یا خانقاہیں ہوں، یا مساجد ہوں یا تبلیغی و دعوتی کام ہوں، جہادی ضرورتیں ہوں، یا طلبہ کی ضروریات ہوں، ان سب پر خرچ اللہ کی خاطر خرچ میں داخل ہے اور اس پر اس حدیث میں یہ وعدہ ہے کہ اللہ کی محبت ملے گی۔

''سخاوت'' اولیا اللہ کی صفت ہے

بزرگو! اسی وجہ سے سخاوت کو ولی کا خاصہ کہا گیا ہے۔ قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ﴿وَ یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْكِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا﴾ [الدھر:۸] (وہ اللہ کی محبت میں مسکین ویتیم وقیدی کو کھانا کھلاتے ہیں)

ایک اور جگہ فرمایا گیا کہ ﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی

وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۞ [البقرة:١٧٧]

(لیکن بھلائی یہ ہے کہ کوئی اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور فرشتوں پر اور اللہ کی کتاب پر اور نبیوں پر ایمان لائے اور اللہ کی محبت میں رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافر کو مال دے)

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ " مَا جَبَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَلِيًّا لَهُ إِلَّا عَلَى السَّخَاءِ " (اللہ نے اپنا کوئی ولی ایسا نہیں پیدا کیا جس میں سخاوت نہ ہو) (جمع الجوامع للسيوطي: ٦٥٠، بسند ضعيف)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سخاوت کا واقعہ

ابھی جو سورۂ دہر کی آیت اوپر سنا تا آیا ہوں، وہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے یہاں فاقہ تھا، کھانے کو کوئی چیز میسر نہیں تھی، آپ نے اس موقعے پر ایک رات کسی کے باغ کو پانی سینچ کر ڈالنے کی مزدوری کی اور اس کام پر صبح کو باغ والے نے کچھ "جو" دیے، آپ اس کو لے کر آئے اور گھر میں اس جو کے تین حصے بنا کر ایک حصہ چکی میں پسوایا اور اس سے "خزیرہ" نام کا ایک کھانا پکایا گیا اور کھانے کے لیے بیٹھے، تو ایک مسکین آیا اور دستک دی کہ اللہ کے نام پر کچھ دے دو، آپ نے اور گھر کے افراد نے وہ سارا کھانا فقیر کو دے دیا؛ پھر باقی آٹے میں سے کچھ نکال کر پکایا اور کھانے بیٹھے، تو ایک یتیم آیا کہ اللہ کے نام پر کچھ دے دو، آپ نے یہ کھانا بھی اللہ کے نام پر اس یتیم کو دے دیا اور آٹے کے آخری بچے ہوئے حصے کو لے کر اس کو پکایا اور کھانے بیٹھے، تو ایک قیدی آیا اور سوال کیا، آپ نے یہ بھی اللہ کے نام پر دے دیا۔ اس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی اور اس میں آپ کی تعریف فرمائی گئی۔

(اسباب النزول واحدي: ٤٠٧)

بھائیو! یہ اللہ کا کرم ہی ہوتا ہے کہ کوئی سخاوت کا کام کیا کرے اور یہ کرم حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم پر اللہ کا بے حد تھا؛ اس لیے وہ حضرات حیرت انگیز قسم کی سخاوت بھی کرتے تھے، جس کا ایک نمونہ یہ ہے۔

بیک وقت ایک لاکھ اسی ہزار کی سخاوت

لیجیے! ایک اور حیرت ناک سخاوت کا واقعہ سنیے! حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی خدمت میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے دو بوریوں میں ایک لاکھ اسی ہزار درہم بھیجے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک طبق منگوایا اور یہ ساری رقم لوگوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیا، جب شام ہوئی، تو اپنی باندی سے فرمایا کہ میری افطاری لاؤ، باندی نے ایک روٹی اور زیتون کا تیل پیش کیا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک خادمہ ''ام درہ'' تھیں، انھوں نے عرض کیا کہ کیا آپ نے جو مال تقسیم کیا اس میں ایک درہم کا گوشت ہمارے لیے نہیں خریدا جا سکتا تھا، جس سے ہم لوگ افطار کرتے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اگر تم نے مجھے یاد دلایا ہوتا، تو میں خرید لیتی۔

یہ حیرت انگیز قسم کی سخاوت ہے کہ خود تو یاد نہیں رہے اور ساری دنیا پر لٹا دیا اور رقم بھی کوئی معمولی نہیں؛ بل کہ ایک لاکھ اسی ہزار درہم، کیا ٹھکانہ ہے اس سخاوت کا!!

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی سخاوت کا ایک واقعہ

اسی طرح ایک واقعہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کا کتابوں میں لکھا ہے، وہ یہ کہ ایک مرتبہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس شہرِ بصرہ کے چند علما آئے، اس وقت حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ بصرہ کے گورنر تھے، انھوں نے کہا کہ ہمارے پڑوس میں ایک صاحب رہتے ہیں، جو صوام وقوام یعنی دن بھر روزہ رکھنے والے اور رات بھر

نماز پڑھنے والے، بڑے عابد و زاہد اور اللہ والے ہیں، ہم میں سے ہر شخص کی خواہش ہے کہ ان جیسے بن جائیں، انھوں نے اپنی لڑکی کا نکاح اپنے ایک غریب بھتیجے سے کر دیا ہے اور وہ اس قابل نہیں کہ اپنی بیٹی کی رخصتی کا انتظام کر سکیں۔ یہ سن کر حضرت ابنِ عباس ان علما کو اپنے گھر لے گئے اور ایک صندوق کھول کر اس میں سے درہموں کی چھ تھیلیاں نکالیں اور فرمایا کہ یہ لے جاؤ، پھر کہنے لگے کہ ٹھہرو! یہ کوئی انصاف کی بات نہیں کہ ہم ایک شخص کی عبادت میں خلل ڈال دیں؛ لٰہذا مجھے بھی ساتھ لیتے چلو تا کہ ہم سب اس کی بیٹی کی رخصتی میں اس کی مدد کریں، دنیا اتنی قابلِ قدر نہیں کہ مومن کی عبادت میں اس سے خلل ڈالا جائے اور ہم اتنے بڑے نہیں کہ اولیا اللہ کی خدمت نہ کریں۔

”ایثار“ سخاوت کا اعلیٰ درجہ

بھائیو! ایک بات یہاں اور جان لیں کہ ”ایثار“ سخاوت کا اعلیٰ درجہ ہے اور ایثار کہتے ہیں ”خود پر دوسروں کو ترجیح دینا“، خود کو بھوک لگی ہے؛ مگر خود نہیں کھاتا دوسروں کو کھلاتا ہے، خود پیاسا ہے؛ مگر دوسروں کو پلاتا ہے۔ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی یہی خصوصیت تھی کہ وہ محض سخی نہیں تھے؛ بل کہ ایثار کرتے تھے؛ اسی لیے قرآن نے ان کی تعریف میں فرمایا کہ ﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ [الحشر: ۹]

(وہ حضرات اپنے پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، اگر چہ خود ان کو تنگی ہو)

یعنی خود کو بھوگ و پیاس وغیرہ کی پریشانی ہے؛ مگر اس کے باوجود وہ حضرات دوسروں کو دیتے ہیں اور خود صبر کر لیتے ہیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کا ایثار-واقعات کی روشنی میں

یہاں ان حضرات کے ایثار کی چند مثالیں سناتا ہوں، ان سے ان کے بلند مقامات کا کچھ تھوڑا سا اندازہ ہوسکتا ہے۔

حدیث و تفاسیر کی کتابوں میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے سخت فاقہ لگا ہے۔آپ نے اپنی عورتوں سے معلوم کیا کہ کوئی چیز تم لوگوں کے پاس ہے؟ لیکن کسی جگہ بھی کوئی کھانے کی چیز نہیں تھی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کیا کہ کوئی ہے، جو ہمارے مہمان کی آج رات مہمان نوازی کرے؟ تو حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے، انھوں نے کہا کہ میں ان کی مہمان نوازی کروں گا؛ پھر ان کو اپنے گھر لے گئے اور اپنی بیوی سے کہا کہ مہمانِ رسول کی خاطر داری میں کوئی کسر نہ چھوڑنا، ان کی بیوی نے کہا کہ آج ہمارے گھر سوائے بچوں کے کھانے کے کوئی چیز نہیں ہے۔انھوں نے کہا کہ بچوں کو بہلا پھسلا کر سُلا دو اور ہم بھی آج اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان کی خاطر بھوکے رہ جائیں گے اور جو کھانا ہے، اس کو لے آؤ اور جب ہم کھانے بیٹھیں، تو کسی بہانے سے چراغ بجھادو، تاکہ مہمان سمجھیں کہ ہم بھی ان کے ساتھ کھا رہے ہیں؛ چناں چہ ان کی بیوی نے ایسا ہی کیا۔ اس طرح مہمان کو سارا کھانا کھلا دیا اور خود وہ اور ان کے بیوی بچے سب بھوکے رہ گئے ۔ جب صبح ہوئی اور یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فلاں مرد و فلاں عورت سے اللہ نے تعجب کیا اور ان کے بارے میں آیت نازل کی ہے؛ پھر یہ آیت سنائی: ﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ [الحشر: ۹]

(وہ حضرات اپنے پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ خود ان کو تنگی ہو)

(الدر المنثور: ۸/۱۰۷، الكشف والبيان للنيسابوري: ۹/۲۶۹)

اسی آیت کے شانِ نزول میں بعض مفسرین کرام نے یہ واقعہ بھی روایت کیا ہے کہ ایک صحابی کو کسی نے بکری کی سِری ہدیے میں بھیجی، ان صحابی نے کہا کہ فلاں بھائی صاحبِ اولاد ہیں، وہ مجھ سے زیادہ اس کے محتاج ہیں؛ لہٰذا ان کو دے دو۔ لہٰذا وہ سری ان کے گھر بھیج دی گئی۔ وہ دوسرے صحابی کہنے لگے کہ میرے سے فلاں صاحب محتاج ہیں؛ لہٰذا ان کو دے دو، وہ سِری وہاں سے ایک تیسرے صحابی کے پاس پہنچی، اس طرح ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے گھر ہوتی ہوتی سات گھروں کا چکر لگا کر اور بعض روایات میں ہے کہ نو گھروں کا چکر لگا کر وہ سِری پھر پہلے صحابی کے پاس ہی آ گئی، اس پر مذکورہ آیت نازل ہوئی۔

(الدر المنثور: ۸/ ۱۰۸، الكشف والبيان للنيسابوري: ۹/۲۶۹)

ایک اور حیرت انگیز واقعہ تاریخ نے محفوظ کیا ہے، وہ یہ کہ حضرت ابوجہم بن حذیفہ رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں اور انھوں نے بڑی لمبی عمر پائی تھی، زمانۂ جاہلیت بھی دیکھا اور زمانۂ اسلام بھی دیکھا تھا، وہ کہتے ہیں کہ جنگِ یرموک میں میرے چچا زاد بھائی کو تلاش کرنے نکلا اور ساتھ میں ایک پانی کا مشکیزہ لے لیا تاکہ اگر وہ مل جائیں اور پانی کی ضرورت پڑے، تو پریشانی نہ ہو، کہتے ہیں کہ میں نے ان کو ایک جگہ پالیا، وہ نزع کی حالت میں زخمی پڑے ہوئے تھے، میں نے ان سے کہا کہ کیا میں تمھیں پانی پلاؤں؟ انھوں نے کہا کہ ہاں! اتنے میں ان کے قریب ایک اور شخص زخمی حالت میں پڑے ہوئے تھے، انھوں نے آہ کی، میرے چچا زاد بھائی نے کہا کہ پہلے ان کو پانی پلاؤ! دیکھا تو وہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے بھائی ہشام بن العاص

رضی اللہ عنہ تھے، میں ان کے پاس پہنچا اور کہا کہ کیا پانی پلاؤں؟ تو انھوں نے کہا کہ ہاں! اتنے میں ایک اور شخص کے کراہنے کی آواز آئی، تو ہشام کہنے لگے کہ اس کو پہلے پلادو، حضرت ابوجہم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں اس کے پاس پہنچا، تو ان کا انتقال ہو چکا تھا، لہٰذا میں ہشام کے پاس آیا، دیکھا تو ان کا بھی انتقال ہو گیا ہے، یہ دیکھ کر میں اپنے چچازاد بھائی کے پاس آیا کہ ان کو پانی پلادوں؛ مگر جب ان کے پاس پہنچا، تو ان کا بھی وصال ہو چکا تھا۔ (مختصر تاریخ دمشق: ۱۴۲/۸)

یہ تھے حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم، جن کے دلوں میں اللہ و رسول کی محبت اس طرح سمائی گئی تھی کہ وہ ہر چیز کو اس کے لیے قربان کر سکتے تھے، یہ اللہ و رسول کے عاشقین بھی تھے اور محبوبین بھی تھے۔

ایک اللہ والے غلام کا کتے پر ایثار

صحابہ رضی اللہ عنہم تو بہر حال صحابہ تھے؛ ان کے علاوہ بھی ایسے لوگ گذرے ہیں، جنھوں نے بے مثال سخاوت و ایثار کا ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ مجھے ایک غلام کا قصہ یاد آیا کہ عبداللہ بن جعفر کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ اپنی ایک زمین کے سلسلے میں ایک مقام پر گیا، وہاں ایک صاحب کے باغ میں بیٹھا تھا، دیکھا کہ ایک کالا غلام وہاں موجود ہے اور کھانا کھا رہا ہے، اس کے پاس تین روٹیاں تھیں، اتنے میں ایک کتا آیا، اور اس غلام نے اس کتے کو ایک روٹی ڈال دی، کتا وہ روٹی کھا کر پھر آیا، اس غلام نے ایک اور روٹی اس کو ڈال دی، کتے نے وہ بھی کھالی اور پھر آ کھڑا ہوا، اس غلام نے آخری روٹی بھی اس کو ڈال دی۔ عبداللہ بن جعفر کہتے ہیں کہ میں یہ سارا ماجرا ایک طرف بیٹھ کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس غلام سے پوچھا کہ روزانہ تجھے کتنی خوراک ملتی ہے؟ اس نے کہا کہ یہی جو آپ نے دیکھی یعنی تین روٹیاں، عبداللہ کہتے

ہیں کہ میں نے کہا کہ تو نے تو ساری روٹیاں کتے کو ڈال دیں، اب تو کیا کھائے گا؟ اس نے کہا کہ میں بس بھوکا رہ جاؤں گا۔ میں نے پوچھا کہ ایسا کیوں کیا؟ تو وہ کہنے لگا کہ اصل یہ ہے کہ یہ علاقہ کوئی کتوں کا نہیں ہے، یہ کتا کہیں دور سے بھوکا آیا ہے، میں نے یہ اچھا نہیں سمجھا کہ میں تو کھالوں اور کتا کھڑا دیکھتا رہے۔

اللہ اکبر! یہ حیرت انگیز سخاوت وایثار ہے، جس کی نظیر ملنی مشکل ہے کہ خود بھوکا رہ کر کتے کو سارا کھانا کھلا دیا، آج لوگ اپنے بھائیوں تک کی طرف نظر نہیں کرتے، سگا بھائی پریشان ہے، خود فضول خرچی کرتے ہیں؛ مگر اپنے بھائی کے کھانے پینے اور دوا، دارو کا بھی خیال نہیں کرتے۔ ہمارے اسلاف کے یہ واقعات بتاتے ہیں کہ انھوں نے سخاوت کے ذریعے مال لٹا کر محبتِ الٰہی کا خزانہ پالیا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ اگر ایک شخص کو اللہ کی محبت اپنا مال خرچ کر کے مل جائے، تو اس سے سستا سودا کوئی نہیں۔

ایک بزرگ کا واقعہ

جیسے ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے اللہ! میں آپ کو پانا چاہتا ہوں، آپ کی قیمت کیا ہے؟ اگر آپ کی قیمت معلوم ہو جائے، تو کوشش کر کے آپ کو پالوں گا۔ اللہ نے فرمایا کہ ”میری قیمت معلوم کرنا چاہتے ہو، تو سنو! کہ میری قیمت دونوں عالم ہیں، اس پر وہ بزرگ وجد میں آگئے اور اللہ کی جناب میں عرض کیا کہ اے اللہ! اگر آپ کی قیمت صرف یہ ہے کہ دو عالم دے دیے جائیں، تو یہ تو بہت سستا سودا ہے۔ کہنے لگے کہ ؂

قیمتِ خود ہر دو عالم گفتۂ ☆ نرخ بالا کن، ارزانی ہنوز

یعنی آپ نے اپنی قیمت دو عالم بتائی ہے، اپنی قیمت میں اضافہ کیجیے! کہ یہ تو بہت کم ہے۔ اس طرح اللہ کی محبت اگر دنیا کے ان معمولی ٹکوں کے بدلے میں مل

جائے ،تو بہت سستا سودا ہے۔

سخاوت کی بہت سی شکلیں ہیں

اب یہاں ایک بات اور سمجھ لیں کہ سخاوت صرف مال کی نہیں ہوتی ؛ بل کہ سخاوت بہت سی چیزوں کی ہوتی ہے۔ایک سخاوت تو مال کی ہوتی ہے، جو مال دار لوگ کریں گے اور ایک سخاوت علم کی ہوتی ہے، جو حضراتِ علما کی جانب سے ہوتی ہے، ایک سخاوت محنت وخدمت کی ہوتی ہے، جو قوت وطاقت والوں کی طرف سے ہوتی ہے؛ لہٰذا ہر شخص اپنی بساط اور اپنی استعداد کے مطابق سخاوت کر سکتا ہے۔کسی کے پاس مال نہیں ہے،تو وہ اپنے علم یا محنت وخدمت کے ذریعے سخاوت کرے،کسی کے پاس علم نہیں ہے،تو وہ نیک لوگوں کی خدمت کرے۔اس طرح کسی نہ کسی طرح سخاوت کا درجہ حاصل کیا جا سکتا ہے اور اس سخاوت کا بھی یہی پھل ہے کہ اللہ اپنی محبت سے نوازتے ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی محبت ومعرفت سے نوازیں اور اپنے محبوب بندوں میں شامل فرمائیں۔آمین۔

انسانی دل
ایک کمپیوٹر ہے!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انسانی دل ایک کمپیوٹر ہے!

ایک حدیث کی جدید اور انوکھی تشریح

الحمدللہ و کفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ. أما بعد: فقد قال النبي صلی اللہ علیہ وسلم ﴿ألا! إِنَّ فِي الْجَسَدِ لَمُضْغَةً إِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّه ، أَلَا ! وَهِيَ الْقَلْبُ﴾

(بخاری: ۱/۱۳، مسلم: ۲/۸۲)

دینی بھائیو! میں نے ایک حدیث پڑھی ہے، جس میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ”کان کھول کر سن لو! کہ جسم کے اندر ایک لوتھڑا ہے، اگر وہ صحیح رہتا ہے، تو جسم کا پورا نظام صحیح رہتا ہے اور اگر وہ ٹیڑھا ہو جائے، خراب ہو جائے، تو جسم کا پورا نظام خراب ہو جاتا ہے، جان لو! کہ وہ لوتھڑا دل ہے“۔

یہ ایک بہت ہی اہم حدیث ہے، جس میں اصلاحِ قلب کی جانب توجہ دلائی گئی ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ دل جسم کے اندر سب سے اہم ہے اور اسی پر جسم کا ظاہری نظام بھی قائم ہے اور باطنی نظام بھی؛ لہٰذا دل کا نظام و سسٹم صحیح ہو، تو جسم کا نظام صحیح رہتا ہے اور اگر دل کا سسٹم خراب ہو جاتا ہے، تو جسم کا پورا نظام و سسٹم برباد ہو جاتا ہے۔

اس وقت میں اس حدیث کی تشریح کرنا چاہتا ہوں اور اللہ نے اس حدیث کی توضیح وتشریح میں ایک بات میرے دل میں ڈالی ہے، اسی کو اس وقت پیش کروں گا بزرگو! ابھی کچھ دیر پہلے یہاں جامعہ میں دو صاحبان ملاقات کے لیے آئے

تھے، جو ایک سافٹ ویر(SOFT WARE) کمپنی میں کام کرتے ہیں، انھوں نے کچھ اصلاحی باتیں سننے کی خواہش کی، ان سے گفتگو کے دوران ایک مضمون دل میں آیا اوراسی کے ساتھ مذکورہ حدیث کا مفہوم اوراس کی شرح بھی سامنے آ گئی، میں نے ان کے سامنے اسی کو پیش کر دیا، میں اسی کو یہاں آپ حضرات کو بھی سنانا چاہتا ہوں۔

خطاب میں مخاطَب کی رعایت

یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ موجودہ دور کمپیوٹر کا دور ہے، سافٹ ویر کا دور ہے، بنگلور بھی اس سافٹ ویر کی دنیا میں بہت آگے ہے، جو صاحبان آئے تھے وہ بھی سافٹ ویر کمپنی میں ملازمت کرتے ہیں؛ اس لیے میرے ذہن میں ایک بات اسی کے حوالے سے آئی؛ کیوں کہ خطاب میں مخاطب کی رعایت ضروری ہے، اگر مخاطب ہو جاہل اوراس سے خطاب کیا جائے عالمانہ وفاضلانہ، تو وہ پوری بات نہیں سمجھ سکتا؛ اسی طرح مخاطب ہو عالم وفاضل اور خطاب میں وہ طریقہ استعمال کیا جائے، جو ایک عامی کے مناسب ہے، تو یہ مناسب نہ ہوگا۔ پھراس میں بھی اگر ڈاکٹر سے اس کی اپنی اصطلاحات وزبان میں گفتگو کی جائے، تو وہ بہت جلد مانوس ہو جاتا ہے اور بات کا اثر جلد قبول کرتا ہے، اگر مخاطب انجینئر ہے اوراس سے گفتگو میں اس کی اصطلاحات کا سہارا لیا جائے، تو اس کا بڑا اثر مرتب ہوتا ہے۔ علما کو اس کی بھی رعایت کرنا چاہیے۔ الغرض! میں نے جب دیکھا کہ یہ لوگ سافٹ ویر انجینئر ہیں، تو میں نے انھی کی زبان میں گفتگو شروع کی۔

کمپیوٹر میں تین چیزیں ہیں

ان کے سامنے جو عرض کیا گیا خلاصہ اس مضمون کا یہ ہے کہ کمپیوٹر میں دو چیزیں ہوتی ہیں: ایک کو ہارڈ ویر(HARD WARE) کہتے ہیں اور ہارڈ ویر اس کا ظاہری

جسم ہے، جو نظر آتا ہے اور دوسری چیز سافٹ ویر (SOFT WARE) ہے، یہ در اصل کمپیوٹر کی جان و روح ہے؛ پھر ہارڈ ویر میں ایک تو اس کی ہارڈ ڈسک (HARD DISK) ہوتی ہے اور ایک اس کا مانیٹر (MONITOR) ہوتا ہے۔ اس طرح کمپیوٹر میں کل تین چیزیں ہوتی ہیں: ایک ہے مانیٹر، دوسری ہے ہارڈ ڈسک اور تیسری ہے سافٹ ویر۔

اب سنیے! کہ مانیٹر تو صرف یہ کام کرتا ہے کہ کمپیوٹر کے اندر کی چیزوں کو اسکرین (SCREEN) پر دکھاتا اور ظاہر کرتا ہے، اس کے سوا اس کا کوئی کام نہیں اور ہارڈ ڈسک اس میں اصل چیز اور اس کی روح ہے، اسی سے کمپیوٹر کا پورا اسسٹم چلتا ہے اور سافٹ ویر اس ہارڈ ڈسک میں ایک چیز ڈالی جاتی ہے، جب آپ سافٹ ویر اس میں ڈالیں گے، تو وہ اس کو اخذ یعنی (CATCH) کر لے گا اور پھر اسی چیز کو مانیٹر کے ذریعے دکھائے گا ، مانیٹر کا کام صرف مظاہرے کا ہے؛ یعنی دکھانے کا، ڈسپلے (DISPLAY) کرنے کا ، اصل چیز یہ نہیں ہے، یہ در اصل کمپیوٹر کا جسم ہے اور ہارڈ ڈسک اس کمپیوٹر کے جسم کا دل ہے اور جو اس کے اندر سافٹ ویر بھرا ہوا ہوتا ہے، وہ در اصل اس کی روح ہے۔

ہارڈ ڈسک کو آپ پکڑ سکتے ہیں، چھو سکتے ہیں، دکھا سکتے ہیں، بتا سکتے ہیں، خرید کر اسے ہاتھ میں اٹھا کر لا سکتے ہیں؛ لیکن سافٹ ویر جو ہارڈ ڈسک کے اندر ڈالا جاتا ہے، اس کو آپ پکڑ نہیں سکتے ،اس کو آپ چھو نہیں سکتے ، یہ ایک معنوی چیز ہے، جو ہارڈ ڈسک کے اندر داخل کر دی جاتی ہے، جب آپ اسے اس کے اندر داخل کریں گے، تو مانیٹر دکھائے گا کہ اس میں کیا کیا چیزیں ہیں، اس کے اندر جو جو عجیب و غریب چیزیں ہیں، وہ سب اس کے اندر سے نظر آئیں گی اور سافٹ ویر ڈالے بغیر کمپیوٹر کوئی

کام نہیں کرسکتا، اس کو کام میں لانا ہو، تو سافٹ ویر اس میں داخل کرنا پڑے گا۔

انسان کی تمثیل کمپیوٹر سے

جب یہ سمجھ میں آ گیا، تو اب یہ سمجھو کہ اسی طرح انسان کی مثال ایک کمپیوٹر کی سی ہے اور اس میں بھی دو چیزیں ہیں: ایک ہارڈ ویر ہے یہ اس کا جسم ہے اور اس میں ایک ظاہری جسم ہے، یہ مانیٹر کے مانند ہے اور ایک اندرونی جسم ہے، یہ دل ہے، یہ ہارڈ ڈسک کی طرح ہے اور یہ دونوں چیزیں انسان میں ہارڈ ویر کی طرح ہیں اور اس ہارڈ ویر کو آپ پکڑ سکتے ہیں، دیکھ سکتے ہیں، کسی کو دکھا بھی سکتے ہیں، دل کو بھی آپ نکالیں گے، تو ہاتھ میں آجائے گا اور یہ دیکھا بھی جاسکتا ہے اور دکھایا بھی جاسکتا ہے اور دوسری چیز اس دل میں ڈالی جانے والی چیز ہے، جیسے ایمان و کفر، نیکی یا برائی، طاعت یا معصیت وغیرہ، یہ اس انسانی کمپیوٹر کا سافٹ ویر ہے۔

بھائیو! اب غور کرو کہ جس طرح کمپیوٹر سافٹ ویر کے بغیر کام نہیں کرتا، اسی طرح دل کے اندر ایمان و نیکی کا سافٹ ویر داخل کیے بغیر انسان بھی صحیح طور پر کام نہیں کرسکتا؛ لہٰذا ایک سافٹ ویر آپ کو اپنے دل کے اندر داخل کرنا پڑے گا، جو سافٹ ویر داخل کریں گے، وہی آپ کے اعمال و افعال سے نظر آئے گا، وہی آپ کے اندر سے نظر آئے گا۔ اب یہ نظر آئے گا کہاں؟ مانیٹر میں! اور وہ مانیٹر انسان کا جسم ہے۔ سافٹ ویر کو رکھنے والی چیز ہارڈ ڈسک ہے اور ہارڈ ڈسک کے اندر جس سافٹ ویر کو آپ نے داخل کر دیا ہے، اس کا مظاہرہ کرنے کے لیے جسم مانیٹر ہے، اس میں آپ کے سارے عمل جو اندر سے آئیں گے، وہ مظاہرے میں آئیں گے؛ اچھا عمل، برا عمل، نیکی و طاعت کا عمل، برائی و معصیت کا عمل، شَر کا عمل، خیر کا عمل، شیطانی عمل، رحمانی عمل، سب اسی جسم پر ظاہر ہوگا؛ لیکن ظاہر کیسے ہوگا؟

دل کی وجہ سے ظاہر ہوگا؛ لیکن دل بھی یہ کام خود نہیں کرتا؛ بل کہ جو سافٹ ویر آپ اس میں ڈالیں گے، اسی سافٹ ویر کو آپ کے اعضا سے دکھائے گا۔

یہ مثال میری سمجھ میں آئی اور مجھے یہ حدیث بھی سمجھ میں آئی کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ جسم کے اندر ایک لوتھڑا ہے، وہ دل ہے، جب وہ صحیح رہتا ہے؛ یعنی جب اچھا سافٹ ویر اس میں داخل کیا جاتا ہے، جب اسے صالح بنایا جاتا ہے، اسے ڈھنگ کا بنایا جاتا ہے، اس کے اندر بہترین چیزیں داخل کی جاتی ہیں، تو جسم بھی صحیح وسالم رہتا ہے اور اگر دل کی ہارڈ ڈسک میں کوئی گندہ سافٹ ویر ڈال دیا، تو جسم سے بھی برائی وخباثت ہی ظاہر ہوگی۔

دل کے لیے ایمانی سافٹ ویر

اب سنیے! اعمال واخلاق، جو جسم سے ظاہر ہوتے ہیں، ان کے صحیح واچھے ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ دل میں ایمانی سافٹ ویر داخل کیے جائیں، یہ ایمانی سافٹ ویر کیا ہیں؟ یہ محبت وعشقِ الٰہی، ذکر و یادِ الٰہی، خوف وخشیتِ الٰہی، توکل واعتماد علی اللہ، انابت وتوجہ الی اللہ، اخلاص وللّٰہیت، خشوع وخضوع، عشقِ رسول، عظمتِ رسول، خوف وفکرِ آخرت، زہد وقناعت وغیرہ کے سافٹ ویر ہیں۔ مثال کے طور پر خوفِ خداوندی کا سافٹ ویر اس میں آپ داخل کر دیں، محبتِ خداوندی کا سافٹ ویر آپ اس میں داخل کر دیں اور عشقِ محمدی کا سافٹ ویر آپ اس میں داخل کر دیں اور اسی طریقے پر آپ اس کے اندر اخلاص کا سافٹ ویر داخل کر دیں، تواضع کا ایک سافٹ ویر داخل کر دیں، اسی طرح بہت سارے یہ سافٹ ویر داخل کیے جا سکتے ہیں، جب اس قسم کے سافٹ ویر اس میں داخل کر دیں گے، تو اب آپ کے اس مانیٹر سے، یعنی جسم کے اعضا سے، اسی طرح کے نیک وعمدہ اعمال وافعال

آنے لگیں گے؛ اب اس سے تواضع چھلکتی ہے، اخلاص اس سے ظاہر ہوتا ہے، اللہ کا خوف محسوس ہوتا ہے، کبھی آنسو چھلک پڑتے ہیں، کبھی دل میں اللہ کے ڈر اور خوف کی وجہ سے ایک قسم کی گھبراہٹ پیدا ہونے لگتی ہے، آدمی کا دل بھی، دماغ بھی سب اس سے متاثر ہوتے ہیں، اللہ کی محبت آجاتی ہے، نمازوں کی طرف دل چلنے لگتا ہے، خشوع وخضوع کے آثار نمایاں ہوتے ہیں، دماغ آخرت کے کاموں کی طرف چلنے لگتا ہے۔

یہ ساری باتیں، جو آپ کے جسم کے مانیٹر سے ظہور میں آتی ہیں، یہ دراصل دل کی ہارڈ ڈسک کی وجہ سے ہیں؛ بل کہ اس کے اندر جو پڑا ہوا سافٹ ویر ہے، اس کی وجہ سے ہیں۔

شیطانی سافٹ ویر

اس کے برخلاف دل کو بگاڑنے والے سافٹ ویر بھی ہوتے ہیں، جو ایمانی سافٹ ویر کے برخلاف دل کو تباہ وبرباد کرتے ہیں، جیسے مثال کے طور پر اللہ سے غفلت کا سافٹ ویر، دنیا کی محبت کا سافٹ ویر، تکبر کا سافٹ ویر، ریاکاری کا سافٹ ویر، خواہشِ نفس کا سافٹ ویر، آخرت سے غفلت کا سافٹ ویر وغیرہ۔اب فرض کیجیے کہ آپ نے دل کی اس ہارڈ ڈسک میں جیسے دنیا کے لوگ کمپیوٹر میں غلط سافٹ ویر بھی داخل کردیتے ہیں۔ مثلاً اس کے اندر ناچ گانا، فحش وعریاں تصاویر، حیاسوز مناظر، یا ایمان سوز باتیں، اسی طرح مختلف قسم کی گندی اور خبیث قسم کی چیزیں، شیطانی قسم کے اعمال کے سافٹ ویر اس میں داخل کردیتے ہیں، اس طرح کے شیطانی سافٹ ویر انسٹال(INSTALL) کر دئے، تو جو سافٹ ویر اس میں رہے گا، وہی نظر آئے گا، آپ اسے کھولیں گے، تو ننگے ناچ بھی نظر آئیں گے،

خباثتیں بھی نظر آئیں گی، شرارتیں بھی نظر آئیں گی۔

اسی طرح دل کے اندر اگر غلط سافٹ ویر آپ نے داخل کر دیا، تو آپ کے اعمال سے بھی اور آپ کے جسم کے مانیٹر سے بھی وہی سب چیزیں چھلکیں گی۔

لہٰذا جو خبائث ورذائل ہمارے اعمال سے صادر ہوتے ہیں، وہ دراصل دل کی ہارڈ ڈسک کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

حدیثِ مذکور کی شرح

اس تمہید کے بعد اب سنیئے کہ اللہ کے نبی صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اسی کو فرماتے ہیں کہ جسم میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے: ''اِذَا صَلُحَتْ '' (جب یہ لوتھڑا صحیح رہتا ہے)، اچھا سافٹ ویر اس میں داخل کیا جاتا ہے، ایمان کا، طاعت و عبادت کے چسکہ کا، محبتِ الٰہی کا، خوفِ الٰہی کا، تقوے وتزکیہ کا اخلاس وللّٰہیت کا، خوف وفکرِ آخرت کا تو پھر کیا ہوتا ہے؟ ''صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّه'' پورے جسم کا نظام صحیح طور پر قائم رہتا ہے اور اس کے مانیٹر سے بھی اچھے اچھے اعمال، اچھی اچھی باتیں صادر ہوتی ہیں؛ زبان سے اللہ کا ذکر، دین کی باتیں، لوگوں کی بھلائی کی باتیں صادر ہوں گی، ہاتھ پیر سے نیک اعمال واخلاق کا ظہور ہوگا، کانوں اور آنکھوں سے بھی صلاح وتقویٰ نکلے گا۔

''و اِذَا فَسَدَتْ'' اور اگر یہ لوتھڑا خراب و فاسد ہو جاتا ہے، غلط سافٹ ویر اس میں داخل کر دیا جاتا ہے، بے ایمانی کا، غفلت کا، معصیت کا، تکبر وعجب کا، دنیا کی محبت کا اور یہ دل کا ہارڈ ڈسک خراب ہو جائے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ '' فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّه '' تو پورے جسم کا نظام خراب ہو جائے گا؛ پھر پورے جسم سے غلط ہی غلط چیزیں نظر آئیں گی، حیا سوز و ایمان سوز اعمال صادر ہوں گے، کفر وشرک دکھائی دے گا، معصیت و گناہ کی باتیں ظاہر ہوں گی، نہ زبان ٹھیک چلے گی، نہ ہاتھ

پیر صحیح کام کریں گے، نہ آنکھ وکان ڈھنگ وسلیقے کے ہوں گے، الغرض! سارا جسم غلط ہی کام کرے گا۔

حضراتِ صوفیا کا کام

لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے دل میں اچھے اچھے سافٹ ویر داخل کرے اور برے وگندے سافٹ ویر سے پرہیز کرے۔ میں کہتا ہوں کہ حضراتِ صوفیا کا یہی کام ہے، وہ آپ کے دل کو نیکی وطاعت کے جذبات سے بھر دینا چاہتے ہیں، وہ اللہ کی محبت ومعرفت سے قلوب کو لبریز کرنا چاہتے ہیں، دنیا کی محبت سے دلوں کو خالی کرنا چاہتے ہیں؛ لہٰذا حضراتِ مشائخ کے یہاں جو محنت ہوتی ہے، اس محنت کا خلاصہ اگر آج کی کمپیوٹر کی زبان میں، سائنس کی زبان میں پیش کیا جائے، تو وہ یہ ہے کہ مشائخ دو کام کرتے ہیں: ایک یہ کہ آپ کو اچھے سافٹ ویر اپنے جسم میں داخل کرنے کی تلقین اور گندے سافٹ ویر سے دور رہنے کی تعلیم دیا کرتے ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ خود یہ سافٹ ویر فراہم بھی کرتے ہیں، اس کی دکان انہیں کے پاس ہے۔

دل کا سافٹ ویر کہاں ملے گا؟

اگر آپ کہیں کہ وہ ایمانی وروحانی سافٹ ویر کہاں ملے گا؟ یہ دنیا کے سافٹ ویر تو ہم کو مل جاتے ہیں، بہت سی کمپنیاں ان کو بناتی ہیں، اور اس کے ایڈ ور ٹا ئیز (ADVERTISE) آتے رہتے ہیں، اخبار میں ایڈورٹائیز، رسائل وجرائد میں ایڈورٹائیز، اسی طرح ٹیلی ویژن میں اس کا ایڈورٹائیز؛ ہر جگہ پر اس کا ایڈورٹائیز ہوتا ہے، بورڈ بہت بڑے بڑے لگے ہوئے ہیں اور ان کی کمپنیاں بڑی بڑی عمارتوں میں قائم ہیں، نظر آتی رہتی ہیں؛ مگر دل کا سافٹ ویر کہاں ملے گا؟

قرآنِ کریم نے اس کا جواب دیا ہے: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ

﴿وَكُونُوا مَعَ الصّٰدِقِينَ﴾ (التوبة: ۱۱۹)

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور نیک لوگوں کے ساتھ رہو) اگر جدید انداز میں موجودہ حالات کے پیش نظر یوں ترجمہ کریں، تو بھی صحیح ہے کہ ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈر کا سافٹ ویر خریدلو'' یہ آج کا جدید ترجمہ ہے، لوگ چاہتے بھی ہیں کہ جدید جدید ترجمے ہوں، لیجیے جدید ترجمہ میں کرر ہا ہوں۔

اس پر سوال پیدا ہوا کہ یہ سافٹ ویر کہاں سے خریدیں؟ تو اس کے جواب میں قرآن نے کہا کہ ﴿وَكُونُوا مَعَ الصّٰدِقِينَ﴾ (نیک لوگوں کی مجلسوں کو چلے جاؤ، ان کے پاس یہ سافٹ ویر مل جائے گا) نیک لوگوں کی معیت میں، مجلس میں، صحبت میں، نیکوں کے قریب رہنے سے وہ سافٹ ویر تم کو مل سکتا ہے۔

معلوم ہوا کہ اولیا اللہ کی مجالس میں، اولیاء اللہ کی صحبتوں میں اللہ نے وہ سافٹ ویر رکھ دیا ہے، جو آدمی ان کی صحبت میں بصدقِ دل رہتا ہے، اسے خریدنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی، دنیا کے سافٹ ویر تو ہزاروں روپے دے کر خریدنا پڑتا ہے؛ لیکن یہاں اولیا اللہ کے پاس سے تو یہ سافٹ ویر مفت میں کاپی (copy) ہو جاتا اور منتقل ہوتا رہتا ہے۔ یہ اللہ والے دل کی ہارڈ ڈسک میں داخل کیے جانے والے سافٹ ویر کے ''سافٹ ویر انجینیر'' بھی ہیں اور اس کے ڈیلر بھی؛ مگر ان کے یہاں کی ڈیلنگ بھی عجیب ہے کہ سب کو مفت میں دیتے ہیں؛ لہٰذا جس کو یہ روحانی وایمانی سافٹ ویر چاہیے، اس کو اولیا اللہ وصالحین کی خدمت میں جانا چاہیے اور ان سے یہ حاصل کرنا چاہیے۔

دل کا وائرس (virus)

یہاں ایک بات یہ بھی سمجھ لیں کہ کمپیوٹر کی دنیا میں ایک چیز اور بھی ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ کمپیوٹر والے کہتے ہیں کہ کمپیوٹر میں وائرس (virus) آجاتا ہے، جس کی وجہ

سے کمپیوٹر کھولتے ہیں، تو اسٹارٹ ہی نہیں ہوتا اور کبھی اسٹک (STUCK) ہو جاتا ہے اور کبھی بہت دیر سے چلتا ہے اور اس کی وجہ سے اس میں ڈلے ہوئے سافٹ ویر خراب ہو جاتے ہیں۔

اب سافٹ ویر انجینیر دیکھ کر کہتا ہے کہ اس میں وائرس (virus) آگیا ہے۔ کیا ہے وائرس؟ کیا بلا ہے یہ؟ وائرس کہتے ہیں زہریلے مادے کو، جب یہ وائرس زہریلا مادہ کمپیوٹر پر حملہ کرتا ہے، تو اس کے نظام کو تہس نہس کر کے رکھ دیتا ہے، یہ تو کمپیوٹر کا وائرس ہے اور ہمارے دل کے لحاظ سے اور آپ کو سمجھانے کے لیے وائرس کا ایک ترجمہ میں یہ کرسکتا ہوں کہ وائرس ہے "شیطان"، وائرس کیا ہے؟ اس ہمارے کمپیوٹر کے شیطان کا نام "وائرس" ہے؛ لہٰذا یہ بھی جب ہم پر حملہ کرتا ہے، تو ہمارے پورے نظام کو تہس نہس کر کے رکھ دیتا ہے، دل خراب، دماغ خراب، آنکھیں خراب، کان خراب، زبان خراب، ہاتھ پیر خراب، سارے اعضا نکمے ہو جاتے ہیں۔

اس شیطانی وائرس کا ذکر حدیث میں آیا ہے؛ چناں چہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ "إِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِيْ مِنَ الْإِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ" (کہ شیطان انسان کے اندر خون کی طرح یا خون کی رگوں میں دوڑتا ہے) (بخاري: ۲۰۳۸، مسلم: ۵۸۰۷، ابن حبان: ۳۷۴۱)

اس حدیث میں ایک لفظ آیا ہے: "مجری الدم" اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ یہ لفظ "مجری" مصدر ہو اور دوڑنے کے معنے میں ہو، اس صورت میں اس حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ شیطان انسان کے اندر اس طرح دوڑتا ہے، جس طرح اس کے اندر خون دوڑتا ہے اور یہ "مجری" اس صورت میں "يجري" کا مفعولِ مطلق ہوگا۔ دوسرے یہ کہ یہ "مجری" اسمِ ظرف ہو اور

دوڑنے کی جگہ کے معنے میں ہو، اس صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ شیطان انسان کے اندر خون دوڑنے کی جگہ میں یعنی اس کی رگوں میں دوڑتا ہے۔ پہلی صورت میں یہ بتایا ہے کہ شیطان انسان کے اندر دوڑتا ہے؛ مگر کہاں دوڑتا ہے؟ یہ نہیں بتایا گیا۔ دوسری صورت میں یہ بتایا گیا ہے کہ شیطان انسان کے اندر کہاں دوڑتا ہے؟ خون دوڑنے کی جگہ میں دوڑتا ہے، یعنی رگوں میں دوڑتا ہے۔ الغرض! شیطان انسان کے اندر دوڑتا ہے، داخل ہوتا ہے اور اس طرح یہ وائرس اس کو بے کار و خراب کرتا ہے۔

دل کا اینٹی وائرس (Anti-Virus)

اس لیے جس طرح کمپیوٹر کو وائرس سے بچایا جاتا ہے، اسی طرح ہمیں بھی خود کو شیطان سے بچانا ضروری ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس وائرس سے کیسے بچیں؟ کمپیوٹر والے کہتے ہیں کہ وائرس بڑا خبیث ہوتا ہے، اس کو ختم کرنے کے لیے اینٹی وائرس (Anti-Virus) سافٹ ویر بھی کمپیوٹر میں داخل کیا جاتا ہے۔ اینٹی وائرس کا مطلب ''زہرِ مخالف'' سافٹ ویر اور وہاں جس طرح اینٹی وائرس ضروری ہے، اسی طرح دل کے لیے ایک اینٹی وائرس یعنی ''شیطان کا مخالف'' سافٹ ویر چاہیے۔ ''اینٹی'' کے معنے ''مخالف''، جیسے اینٹی اسلام کے معنی کیا؟ اسلام مخالف؛ اسی طرح اینٹی وائرس کا مطلب ہوا ''وائرس مخالف'' یہ وائرس اس میں آ گیا، اس کا ایک مخالف سافٹ ویر اس میں داخل کرنا پڑتا ہے، جب آپ اس میں وہ ڈالیں، تو جوں ہی وائرس اس میں داخل ہوگا، فوراً وہ بتائے گا کہ آپ کے کمپیوٹر میں وائرس آ گیا ہے، مجھے کام میں لاؤ، میں اس کو پکڑ کے ختم کردوں گا۔ اگر آپ نے اس پر کلک کردیا، تو کلک کرتے ہی وہ فوراً اسے پکڑ کر جہاں بھی ہوگا اسے ختم کردے گا۔

یہ ہے اینٹی وائرس سافٹ ویر۔

اسی طرح بھائیو! ہمارے دل کے لیے بھی ایک اینٹی وائرس سافٹ ویر کی ضرورت ہے، تاکہ ہمارا نظامِ دل وجسم خراب نہ ہوجائے۔

یہ اینٹی وائرس کیا ہے؟ وہ اللہ کا ڈر وخوف ہے اور یہ ''خوفِ الٰہی کا اینٹی وائرس سافٹ ویر'' بھی حضراتِ اولیا اللہ ہی ہمارے دل میں داخل کرتے ہیں اور اسی کا نام ''اینٹی شیطان'' ہے۔ تو خوفِ الٰہی کے اینٹی وائرس کو دل میں ڈال کے چھوڑ دو، اب وہ دل میں پڑا رہے گا، جہاں کہیں شیطان آپ کے جسم پر حملہ کرے گا، یا دل میں گھس کر بہکائے گا، تو وہ فوراً پکڑ لے گا اور اس کو باہر نکال دے گا۔

خلاصۂ کلام

میرے بھائیو! اس تمام تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے اندر دل اصل ہے، اس کی اچھائی و برائی کا اثر ہمارے ظاہر پر پڑتا ہے، دل اچھا، تو سب اچھا، دل بُرا تو سب برا؛ لہٰذا ہمیں ضرورت ہے کہ ہم اپنے دل کی اصلاح وتزکیہ کا کام کریں اور اس کا طریقہ یہ سمجھ میں آیا کہ اس میں ایمانی وروحانی سافٹ ویر داخل کریں، یہی کہنا ہے کہ ہمارے دلوں میں بہترین سافٹ ویر داخل کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ کے عشق کا، اللہ کے خوف کا، اللہ کے تقوے کا اور اسی طریقے پر اخلاص کا اور تواضع کا، اور نیکیوں کا، نماز سے لگاؤ کا اور دین کے کاموں سے الفت ومحبت کا، یہ سب سافٹ ویر ہیں اور ایک کمپیوٹر میں بہت سارے سافٹ ویر داخل کیے جاسکتے ہیں اور وہ سب کام کرسکتے ہیں۔ اسی طرح برے وخبیث سافٹ ویر سے اس کو دور رکھیں؛ نیز شیطانی وائرس سے اس کو بچائیں؛ مگر یہ ایمانی وروحانی سافٹ ویر کہاں ملے گا؟ یہ اہل اللہ کی خدمت میں جانے سے ملے گا، اسی طرح وائرس سے بچانے کے لیے اس

دل کی ہارڈ ڈسک میں اینٹی وائرس داخل کرنے کی ضرورت ہے اور یہ بھی اہل اللہ کے پاس ملے گا؛ لہٰذا ان کی خدمت میں جایا جائے اور ان کو حاصل کیا جائے۔

اسی طرح دل کی اس ہارڈ ڈسک کے اندر آپ ان سافٹ ویروں کو داخل کر دیجیے وہ سب اندر پڑے پڑے آپ کو بہترین انسان بنائیں گے اور آپ کے مانیٹر سے یعنی جسم کے اعضا سے بہترین اعمال صادر کر کے لوگوں کو بتائیں گے۔

اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ کو بھی سمجھ عطا فرمائے اور عمل کی بھی توفیق عطا فرمائے۔

آمین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم
کی ذات اسوۂ حسنہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اسوۂ حسنہ

الحمد للّٰہ و کفیٰ و سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ . أما بعد:

فقد قا ل اللّٰہ تعالیٰ فی القرآن الکریم :

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الأحزاب : ۲۱)

(تحقیق کہ تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں بہترین نمونہ ہے)

بلا اتباعِ نبی کوئی اللہ تک نہیں پہنچ سکتا

قرآن اور حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا اور آپ کے اسوۂ حسنہ کو اپنے لیے قابلِ تقلید بنانے کا مختلف جگہ متعدد عنوانات کے ساتھ ذکر موجود ہے اوراولیا اللہ کا؛ بل کہ تما م امت کا اس بات پر اتفا ق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے بغیر کوئی بھی شخص اللہ کے دربار میں کوئی مقام حاصل نہیں کرسکتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے ذریعے ہی محبتِ خداوندی کا دروازہ کھلتاہے، اگر اتباعِ محمدی کے بغیر کوئی شخص محبتِ خداوندی کا دروازہ کھٹکھٹا تا ہے، تو قیامت تک نہیں کھل سکتا؛ یہی ایک راستہ ہے، جو اللہ نے خود مقرر کردیا ہے ، جب اللہ خود کسی راستے کو متعین کردے، مقرر کردے اور یہ بتادے کہ اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے، تو پھر کسی اور راستے پر چلنے سے کامیابی کیسے مل سکتی ہے؟

تو معلوم ہوا کہ یہی ایک راستہ ہے اللہ کی محبت کا اور اللہ کے راستے میں چلنے کا

کہ محمد رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی اتباع کی جائے؛ اسی لیے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا ہے: ﴿قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ﴾ (اے نبی! آپ کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کو چاہتے ہو، تو میری اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریں گے) (آل عمران: ۳۱)

باقی تجارت میں، دنیا میں، دنیا کی چیزوں میں آگے بڑھ جائے، تو وہ الگ بات ہے؛ لیکن اللہ کے دربار میں کوئی مقام، کوئی منزلت آدمی کو اسی وقت ملتی ہے اور مل سکتی ہے؛ جب کہ وہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی اتباع کرتا ہو اور آپ کی اتباع تمام معاملات کے اندر ضروری ہے، عقائد میں، عبادات میں، معاملات میں، معاشرت میں، اخلاق میں، سیاست میں، تعلیم میں، تہذیب میں، تمدن میں، تمام چیزوں میں آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی اتباع کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔

اُسوہ کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے: ﴿لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ﴾ (تمہارے لیے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ذات میں بہترین نمونہ ہے) محض اسوہ نہیں کہا؛ بل کہ اسوۂ حسنہ، یعنی بہترین اسوہ و بہترین نمونہ فرمایا، اسوہ اور نمونہ وہ چیز ہوتی ہے، جس کو دیکھ کر دوسری چیز تیار کی جاتی ہے، جیسے کپڑوں کا جوڑا نمونے کے طور پر دیا جاتا ہے، تاکہ اس کے مطابق دوسرا کپڑا ڈھالا جائے، سیا جائے، گھر کا ماڈل دیا جاتا ہے، تاکہ دوسرا گھر اسی کے مطابق بنایا جائے، جوتے کا ماڈل دیا جاتا ہے، تاکہ اسی کے مطابق دوسرا جوتا تیار کیا جائے۔

اس طرح آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی زندگی اور آپ کی زندگی کا ہر عمل ساری دنیائے انسانیت کے لیے ایک ''ماڈل'' ہے اور ''بہترین نمونہ'' ہے، عقائد ہیں، تو

اس میں بھی آپ نمونہ ہیں، اعمال و عبادات ہیں، تو اس میں بھی آپ نمونہ ہیں، معاشرت وتہذیب ہے، تو اس میں بھی نمونہ ہیں اور اخلاق ہیں، تو اس میں بھی آپ ہمارے لیے نمونہ ہیں ، اسی طرح تمام معاملات میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نمونہ ہیں؛ پھر اسی کے ساتھ آپ کی آنکھیں نمونہ ہیں ہماری آنکھوں کے لیے، آپ کے کان نمونہ ہیں ہمارے کانوں کے لیے، آپ کا دل نمونہ ہے ہمارے دل کے لیے، اسی طرح آپ کی زبان نمونہ ہے ہماری زبان کے لیے، آپ کے ہاتھ پیر نمونہ ہیں ہمارے ہاتھ پیر کے لیے۔

انسان اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی مشین ہے

اس کو اس طرح سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک مشین کی طرح بنایا ہے، اس کے اندر بہت سے پرزے لگے ہوئے ہیں اور یہ ایسی مشین ہے، جس کے اندر ہر پرزہ اپنا اپنا کام کرتا ہے، جیسے دل ایک پرزہ ہے، زبان ایک پرزہ ہے، آنکھ، ناک، کان ان میں سے ہر ایک، ایک ایک پرزہ اور پارٹ ہے، ہاتھ، پیر یہ الگ الگ پرزے ہیں، اس کے علاوہ بہت سے اجزا، اعضا، بہت سے پارٹس، بہت سے پرزے، اس مشین میں لگے ہوئے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ مشین ایک ہے؛ لیکن اس کا ہر پارٹ الگ پارٹ ادا کرتا ہے؛ یعنی الگ الگ کام کرتا ہے، بہت سی مشینیں دنیا میں ایسی ہوتی ہیں کہ بہت سے پارٹ ملنے کے بعد کام ایک ہی کرتے ہیں۔ مثلاً: ’’فریج‘‘ ہے، فریج میں بہت سے پارٹس ہیں؛ لیکن پورے پارٹس مل کر کام تو ایک ہی کرتے ہیں، اسی طریقے پر ’’بس‘‘ ہے ایک مشین ہے، اس کے اندر بہت سے پارٹس ہیں، پورے پارٹس مل کر جب کام کرتے ہیں، تو کام تو ایک ہی ہوتا ہے۔

لیکن ہماری مشین جو اللہ نے بنائی ہے، یہ مشین ایسی ہے کہ اس کا ہر پارٹ کام کرتا ہے اور ہر ایک کا کام الگ الگ ہوتا ہے، یہ نہیں کہ پورے اجزا اور پارٹس مل کر ایک ہی کام کرتے ہوں، مثلاً ناک کا کام الگ ہے، اس کی مستقل ایک ڈیوٹی ہے، زبان کا جو کام ہے وہ مستقل کام، آنکھ کا جو کام ہے وہ مستقل کام، اسی طرح کان کا کام ہے، تو وہ مستقل کام، اس طرح ہر پارٹ الگ الگ کام کرتا ہے۔

''کتاب اللہ'' اور ''رجال اللہ'' اس مشین کو چلانا سکھاتے ہیں

اس مشین کو چلانے کے لیے اور صحیح نہج پر اس کو (Active) کرنے کے لیے اور صحیح نہج پر اس کی نگرانی کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک تو اپنی کتاب نازل کی، جس کے اندر اس کے اصول و طریقے بتا دیے کہ یہ مشین تمھیں ان ان اصولوں پر اور اس اس طرح چلانا ہے؛ لیکن مشین چلانے کے لیے صرف صحیفوں و کتابوں میں لکھے ہوئے حروف اور نقوش کام نہیں آتے؛ بل کہ اسے عملاً (Practical) بھی بتانا ضروری ہوتا ہے؛ اس کے لیے حضرت محمد رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو بھیجا۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے، جیسے کوئی فیکٹری (Factory) مشین تیار کرتی ہے، تو اس کا بروشر (Brochure) بھی تیار کرتی ہے اور ساتھ ساتھ کچھ اس مشین کو چلانے کے لیے اور اس کا مظاہرہ کرنے کے لیے بھی کچھ لوگ تیار کیے جاتے ہیں، وہ آ کر آپ کو بتاتے ہیں کہ اس مشین کو چلانے کے لیے پہلے یہ بٹن دبانا ہے، پھر یہ بٹن دبانا ہے اور اس طرح سے کام لینا ہے، اگر ایسا ہو جائے، تو ایسا کرنا ہے، اور ایسا ہو جائے، تو یوں کرنا ہے۔ ایک طرف بروشر میں بھی یہ پورا طریقہ لکھا ہوا ہوتا ہے اور اس کے اندر ہر ہر پارٹ کی تصویر بھی ہوتی ہے اور ان کے نام کی نشاندہی بھی کی جاتی ہے، پھر ہر پارٹ کا کام بھی بتایا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ اس کا طریقہ بھی

بتایا جاتا ہے کہ اس کو کس طرح (Operate) کرنا چاہیے۔ الغرض! بروشر میں سب کچھ لکھا ہوا موجود ہوتا ہے؛ لیکن کتنے لوگ ہیں، جو صرف اس کو دیکھ کر چلانا سیکھ لیتے ہیں؟ شاید ہزاروں میں ایک ہوگا۔ جب دنیا کی مشین میں صرف لکھا ہوا کام نہیں آتا؛ بل کہ اس کے لیے کچھ (Practical) بتانے والے ضروری ہوتے ہیں، تو پھر آپ سوچیے کہ یہ اللہ کی بنائی ہوئی مشین، جو بہت با مقصد طور پر پیدا کی گئی ہے، اس کے ہر ہر جزو، ہر ہر پارٹ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے بڑی حکمتیں، بڑی مصلحتیں رکھی ہیں اور انکا الگ الگ کام مقرر کر دیا ہے اور اس کام کو لینے کے لیے اس کا ایک طریقہ بھی مقرر کر دیا ہے کہ اس طریقے پر اس سے یہ کام لینا ہے، تو پھر اس کو بتانے کے لیے صرف صحیفۂ خداوندی کافی نہ تھا؛ بل کہ رجالِ خداوندی کی بھی ضرورت تھی؛ اسی لیے علما نے لکھا ہے کہ اللہ نے شروع دور سے ایک طرف کتاب اللہ کا سلسلہ جاری کیا ہے، تو دوسری طرف رجال اللہ کا بھی سلسلہ جاری کیا ہے، اللہ کی کتاب بھی آتی ہے اور اللہ کی طرف سے کچھ رجالِ کار بھی آتے ہیں، وہ آکر بتاتے ہیں کہ یہ طریقہ زندگی کرنے کا ہے، اس مشین کے چلانے کا، اس کے استعمال کرنے کا، اگر اس مشین کو اس کے برخلاف استعمال کروگے، تو یہ خراب ہو جائے گی اور اگر صحیح طریقے پر استعمال کر، وتو ٹھیک وصحیح سالم رہے گی۔

بہت سے انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام آئے اور آخر میں ہمارے اور آپ کے آقا حضرت سیدنا ومولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپ نے اپنی زندگی کے اندر ایک ایک چیز کے بارے میں تفصیلی معلومات اور عملی طور پر اس کا ایک نمونہ ہمارے سامنے رکھ دیا، آنکھ کے بارے میں بھی رکھا، کان کے بارے میں بھی رکھا، دل کے بارے میں بھی رکھا، زبان کے بارے میں بھی رکھا، ہاتھ پیر کے بارے میں بھی رکھا کہ یہ سب کے سب اجزا اور پارٹ کس طرح

استعمال میں لانا ہے اوران کو اگر غلط استعمال کریں گے، تواس کا نتیجہ کیا ہوگا ؟ یہی بات ہمیں اور آپ کو سیکھنا ہے، حضرت محمد رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی سیرت کے ذریعے سے کہ ہماری اس مشین کو جو اللہ کی بنائی ہوئی ہے، دنیا میں ٹھیک ٹھیک چلا کر اس کو استعمال کر کے کیسے اس سے کام لیں۔

یہ مشین بطورِ امانت دی گئی ہے

یاد رکھیں کہ یہ اللہ کی عطا کردہ مشین ہے اور ہم کو بطورِ امانت دی گئی ہے، بطورِ ملکیت نہیں دی گئی ہے، ایک ہوتا ہے بطورِ ملکیت دے دینا اور ایک ہوتا ہے بطورِ امانت اور ودیعت دینا، بطورِ ملکیت دے دینے پر ہم مختارِ کل ہوتے ہیں جو چاہیں کریں؛ لیکن اللہ نے ہم کو بطورِ ملکیت نہیں دیا، ہم کو اس کی (Ownership) نہیں دی ؛ بل کہ ہمارے پاس محض بطورِ امانت کے رکھی ہوئی ہے؛ اسی لیے ایک حدیث میں اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اللہ کو مخاطب بنا کر عرض کیا ہے کہ **اللّٰھم إن قلوبنا وجوارحنا بیدک ، لم تملکنا منھا شیئا ، فإذا فعلت ذٰلک بھما فکن أنت ولینا** ”(اے اللہ! بلا شبہ ہمارے قلوب اوراعضا آپ کے قبضے میں ہیں، ان میں سے کسی چیز کا آپ نے ہمیں مالک نہیں بنایا، پس جب آپ ان کو ایسا کریں، تو آپ ہی ہمارے محافظ بن جائیں)

(الجامع الصغیر: ۱۵۱۲، کنز العمال: ۳۶۴۴)

معلوم ہوا کہ ہم ہمارے اعضاء کے مالک نہیں ہیں کہ جو چاہیں کریں ؛ بل کہ صرف امین ہیں؛ اسی لیے علما نے مسئلہ لکھا ہے کہ ہمارے اس جسم کا کوئی عضو اور پارٹ اٹھا کر ہم اپنی مرضی سے کسی کو نہیں دے سکتے ، مثلاً آپ کے جی میں آیا کہ اپنے بھائی کو میں اپنا گردہ دے دوں، اپنی آنکھ کسی کو دے دوں تو یہ جائز نہیں ہے۔

آپ کو کیا اختیار ہے؟ کیا یہ آپ کی اپنی Body ہے؟ آپ کا جسم ہے؟ آپ کی آنکھیں ہیں؟ آپ کے گردے ہیں؟ آپ کا دل ہے؟ نہیں !؛ بل کہ یہ تو سب اللہ کا ہے اور اللہ کی اجازت کے بغیر اس میں کسی کو تصرف کا حق نہیں ہے؛ اس لیے مسئلہ یہ ہے کہ ان اجزا و اعضا میں سے کسی عضو کو بغیر اللہ کی مرضی کے نہیں دے سکتے۔

اب رہا یہ کہ اللہ کی مرضی کب ہے، کب نہیں، کیسے معلوم ہوگا ؟ آپ مفتی سے پوچھیں، مفتی بتائے گا کہ اللہ کی مرضی ہے کہ نہیں، اس لیے کہ وہ قرآن میں غور کرے گا، احادیث میں غور کرے گا، دلائل میں غور کرے گا اور فتویٰ دے گا۔

اگر مشین کا غلط استعمال ہو، تو خراب ہو جائے گی

ایک اور بات بھی یہاں سمجھ لیں کہ مشین کا استعمال اگر غلط ہو اور آپ اس سے وہ کام کرنا چاہیں، جو اس کے فساد و خرابی کا سبب بنے، تو وہ مشین خراب ہو جائے گی اور اس کے اوپر کچھ دوسرے اثرات مرتب ہو جائیں گے۔ یہاں یہ سمجھ لیں کہ کسی بھی چیز کا استعمال صحیح اسی وقت ہوگا، جب اس میں دو باتوں کا دھیان دیں گے : ایک تو یہ کہ اس چیز کو اسی کے مقصد میں استعمال کیا جائے اور دوسرے یہ کہ اس کو اسی طریقے کے مطابق استعمال کریں، جو اس کے لیے مقرر ہے۔

مثال کے طور پر ہمارے سامنے یہ ''ٹیوب لائٹ''(TUBE LIGHT) جل رہا ہے، اس کو ایک تو اسی مقصد میں استعمال کرنا چاہیے، جس کے لیے یہ بنایا گیا ہے، یہ بنایا گیا ہے ہمیں روشنی دینے کے لیے، اگر کوئی بے وقوف اس کام کے بجائے اس کو کسی اور کام مثلاً کسی کو مارنے میں استعمال کرے یا عصا بنا لے تو ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا ؟ اسی طرح ''کتاب'' پڑھنے، مطالعہ کرنے کے لیے ہے، اگر کوئی اس سے پنکھے کا کام لینے لگے، تو یہ بات غلط ہوگی، کیوں کہ اس کے مقصد کے

خلاف استعمال کیا گیا۔

دوسرے یہ بھی ضروری ہے کہ چیز کے استعمال کرنے کا طریقہ بھی سیکھا جائے، ٹیوب لائٹ جلانے یا پنکھا چلانے کا ایک طریقہ ہے، استعمال کرنے کا ایک انداز ہے کہ کس طرح اس کو استعمال کریں؟ اگر خدانخواستہ اس طریقے کے مطابق استعمال نہ کریں، تو ہوسکتا ہے کہ اس کا فائدہ نہ ہو اور خراب ہو جائے، مثلاً: ایک آدمی نے دیکھا کہ ٹیوب لائٹ جل نہیں رہا ہے، اس کے جی میں آیا کہ یہ تو جلتا نہیں ہے، اس کو جلانا ہے، اس بیوقوف نے سوچا کہ یہ کیوں نہیں جلتا؟ اس کو میں جلاتا ہوں، میں روزانہ اپنے گھر کا ''اسٹو'' ماچس کی تلی جلاکر جلالیتا ہوں اور وہ جل جاتا ہے؛ لہٰذا یہاں بھی میں اس کو جلاؤں گا، اس نے ایک ماچس لاکر اس سے ایک تلی نکالی اور اس کو جلایا اور اس سے ٹیوب لائٹ جلانے لگا۔

اب بتائیے کہ اس کا حشر کیا ہوگا؟ اس کو ساری دنیا کہے گی کہ یہ طریقہ نہیں ہے اس کو جلانے کا، یہ طریقہ دوسری چیزوں کے لیے استعمال ہوسکتا ہے؛ لیکن یہ طریقہ اس کے لیے استعمال کریں گے، تو اس کے لیے خطرہ ہی خطرہ ہے۔

اولاً تو وہ کالا ہو جائے گا اور پھر ہوسکتا ہے کہ اگر تیز بھاپ اس کو لگ جائے، تو پھٹ بھی جائے؛ اس لیے کہ یہ طریقہ اس کے استعمال کا ہرگز نہیں ہے۔

اب یہاں ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ایک چیز کو جلانے کا جو طریقہ مقرر ہے، اس طریقے کے خلاف اگر اس کو استعمال کیا جاتا ہے، تو اس کو خطرہ ہے کہ نہیں ہے؟

اسی طرح بھائیو! اگر ہمارے دل کو روشن کرنے کے لیے، دل کے اندر نور اور اُجالا پیدا کرنے کے لیے کوئی آدمی وہ چیز استعمال نہ کرے، جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے اور وہ چیز استعمال کرے جسے حضور اقدس

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اس کے لیے خطرہ بتایا ہے، تو پھر اس کا دل روشن نہیں ہو سکے گا، دیکھیے ماچس سے آپ سگریٹ جلا سکتے ہیں، موم بتی جلا سکتے ہیں، اپنی گیس لائٹ جلا سکتے ہیں؛ لیکن ٹیوب لائٹ ہر گز نہیں جلا سکتے؛ بل کہ جلائیں گے تو کالا ہو جائے گا۔

اسی طرح سمجھیے دل بھی ایک روشن چیز کی طرح ہے، اس میں ایک آگ جلانے اور دھکانے کی ضرورت ہے؛ وہ آگ جو اس میں لگے گی وہ ''عشقِ الٰہی'' کی آگ ہے، اگر دل میں عشقِ الٰہی کی آگ جلا کر آپ اس کو روشن کریں گے، تو انشا اللہ اس کی روشنی بڑی خوبصورت ہوگی اور بہت دور دور تک پہنچے گی، آپ کو بھی روشن کرے گی اور آپ کے پاس بیٹھنے والوں کو بھی روشن کرے گی؛ لیکن اگر کوئی بے وقوف صاحب اللہ کی محبت سے دل کو جلانے کے بجائے، دنیا کی محبت سے جلانا چاہیں، تو دل کالا ہو جائے گا، روشن کبھی نہیں ہوگا۔

معلوم ہوا کہ دل کو روشن کرنا ہو، تو محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے پوچھنا پڑے گا کہ آپ کا اُسوہ کیا ہے؟ آپ کو اللہ نے کیا طریقہ دے کر بھیجا ہے؟ وہ طریقہ آپ ہم کو بتائیں، تا کہ ہم اس طریقے سے اپنے دل کو روشن کریں۔ اسی طرح آنکھیں ہیں اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے آنکھوں سے جو کام لیا اور جس انداز سے کام لیا، آنکھوں کو اسی طرح استعمال کرنا چاہیے اور اسی مقصد میں استعمال کرنا چاہیے اور اگر اس کو مقصد سے ہٹا کر استعمال کریں گے اور غلط طریقے پر اس کو استعمال کریں گے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آنکھوں کو اجاڑنے کا ہم کام کر رہے ہیں، آنکھوں کو بسانے کا کام ہم نہیں کر رہے ہیں، محمد رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے آنکھوں سے کیا کام لیا؟ اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے دل سے کیا کام لیا؟ وہی کام ان سے ہمیں بھی لینا ہے۔

دل معرفتِ الٰہی کی تجلی گاہ ہے

اس لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیث کے ذریعے بھی اور اپنے عمل کے ذریعے بھی بتایا ہے کہ دل کو اللہ کی محبت اور معرفت کا مسکن اور ٹھکانہ بناؤ، یہ ہے دل کا کام، اگر کوئی اس کے بجائے دل کے اندر دنیا بھر کی غلاظتیں لے جا کر بھر ڈالے، عورت کی محبت دل میں ہے اور انسانوں کی محبت دل میں ہے، چیزوں کی محبت دل میں ہے اور مکانوں کی محبت دل میں ہے، پکوان کی محبت دل میں ہے، کھانوں کی محبت دل میں ہے، تو اس کی مثال ایسی ہے، جیسے کوئی آدمی بہترین قسم کا محل بنانے کے بعد اس کے اندر تمام قسم کی غلاظتیں اور مختلف قسم کی گندگیاں لا کر ڈال دے۔ دل معرفتِ الٰہی کی تجلی گاہ ہے، اللہ تعالیٰ کی محبت کا مسکن ہے، اس کے اندر دنیا کی اور مختلف قسم کی محبتیں لا کر ڈال رہا ہے، تو یہ گندگیاں ہیں، غلاظتیں ہیں، یہ غلاظتیں دل کے اندر آجائیں گی، تو بھائی! ذرا اندازہ کیجیے، آپ اس آدمی کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ جس نے محل بنایا اور پھر محل کے اندر غلاظتیں لا کر جمانا شروع کر دیا۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دل کیسا تھا؟

الغرض! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل ہمارے لیے اُسوۂ حسنہ ہے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دل کیا کیا کام کرتا تھا؟ کن کن خوبیوں کا وہ دل مالک تھا؟ کن چیزوں کو اس میں جگہ نہیں دی تھی؟ اس کے مطابق ہم کو اپنا دل بنانا ہے۔ آج ہمارے دلوں کو ہم دیکھ لیں کہ اس دل کے اندر وہ چیزیں جمع ہیں، جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں نہیں تھیں اور وہ چیزیں ہمارے دل میں موجود نہیں ہیں، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں موجود تھیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دل وہ دل تھا کہ

اس میں دنیا کی محبت ایک رائی کے برابر نہیں تھی اور خدا کی محبت سو فیصد بسی ہوئی تھی۔

حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کافروں کے بہت سارے گرو گھنٹالوں نے ایک آدمی کو بھیجا، وہ آپ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ اے محمد! مجھے فلاں اور فلاں نے آپ کے پاس بھیجا ہے، میں مکہ کے سرداروں کی طرف سے آیا ہوں اور مجھے ایک بات آپ کے سامنے رکھنی ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا بات ہے؟ اس نے کہا کہ میں یہ پیغام لے کر آیا ہوں کہ اگر آپ دینِ اسلام چھوڑ دیں، تو ہم آپ کو حکومت و سرداری دینے تیار ہیں، ہم آپ کو اپنا سردار بنالیں گے اور آپ چاہیں، تو ساری دولتیں آپ کے قدموں میں لاکر ڈال دیں گے اور اگر آپ کا مقصد عیش و راحت ہے، تو ہم عرب کی خوبصورت لڑکیاں آپ پر نچھاور کردیں گے؛ بس یہ شرط ہے کہ آپ یہ دین کا کام کرنا چھوڑ دیں، توحید وسنت کا کام بند کردیں۔

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کی بات سننے کے بعد پوچھتے ہیں، آپ کی بات ختم ہوگئی؟ وہ کہتا ہے ہاں! میں نے اپنی بات پوری کرلی۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ''اب میری بات سنو'' اس کے بعد آپ قرآن مجید کی تلاوت شروع کردیتے ہیں، سورۂ ''حٰم سجدۃ'' کی آیتیں پڑھنی شروع کردیتے ہیں، آپ پڑھتے رہے، یہاں تک کہ وہ آیتیں آگئیں، جس میں قومِ عاد کا اور مختلف قوموں اور لوگوں کا ذکر ہے، ان کی ہلاکت وتباہی کا ذکر ہے، تو اس آدمی سے برداشت نہ ہوا اور وہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچ کر آپ کے منھ پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے: ''اللہ کے لیے اس کو بند کرو میرے سینے میں اس کو سننے کی طاقت موجود نہیں ہے'' اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بند کردیتے ہیں، تو وہ اٹھ کر چلا جاتا ہے۔

کافر لوگ، مکے کے سردار وہاں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتے ہیں کہ آپ کے پاس سے کیا جواب لاتا ہے؟ لیکن اس آدمی میں ان سے بات کرنے کی طاقت نہیں تھی، تو اپنے گھر چلا گیا اور تین دن تک لوگوں کو نظر بھی نہیں آیا، تین دن کے بعد وہ لوگوں کے سامنے آتا ہے اور کہتا ہے: ''محمد ایک ایسا کلام پیش کرتے ہیں کہ میں نے کبھی ایسا کلام نہیں سنا ہے''۔ (تفسیر القرطبي : ۱۵/ ۳۳۸،حیاۃ الصحابة: ۱/ ۳۷)

تو بھائیو! ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا دی جا رہی تھی، دولت و مال آپ کے قدموں میں ڈالنے کے وعدے کیے جا رہے تھے؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ امارت، عیش وعشرت اور مال و دولت تو میرے پیروں میں ہے، اس میں سے کسی کو بھی لینا نہیں چاہتا، دنیا کی دولت اور دنیا کی چیزوں کی محبت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کے اندر ایک پائی کے برابر بھی نہیں تھی۔

مال و دولت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا استغنا

حدیث میں آتا ہے کہ مدینہ ہجرت کے بعد بہت سارے ممالک فتح ہوتے چلے گئے، بحرین کا ملک بھی فتح ہو گیا، اس وقت اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بحرین بھیجا کہ جاؤ (tax) ٹیکس وصول کر کے لاؤ؛ چناں چہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم گئے اور بحرین سے دولت کا انبار لے کر آئے، اس میں سونا، چاندی، اناج وغلہ اور کپڑا اور دیگر مختلف قیمتی چیزیں تھیں۔

یہ سب چیزیں مسجدِ نبوی کے صحن میں جمع کر دی گئیں اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر کر دی گئی۔ ذرا سوچیے کہ اگر میں یا آپ اس جگہ ہوتے، تو جا کر کم از کم دیکھتے کہ کتنی دولت آئی ہے؟ اور کیا کیا مال آیا ہے؟ لیکن اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ٹھیک ہے، مسجد میں ڈال دو اور آرام کرو، صحابہ رضی اللہ عنہم

اپنی اپنی جگہ چلے گئے،لوگوں میں شہرت ہوگئی کہ بحرین سے بہت کچھ مال آگیا ہے، (یہ دور فقر وفاقہ کا دور تھا، ایسے دور میں بحرین سے اس قدر مال جمع ہوگیا تھا) فجر کی نماز کا وقت ہوگیا، تو مدینے کی مختلف مساجد کے نمازی بھی مسجدِ نبوی کے اندر آکر جمع ہوگئے، ایک جمِ غفیر دوسرے دنوں کے لحاظ سے کچھ زیادہ ہی تھا، اب لوگ انتظار میں ہیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ فجر پڑھانے کے لیے آئیں گے؛ چناں چہ وقت ہوا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، حضرت بلال رضی اللہ عنہ ساتھ میں موجود تھے لوگوں کا خیال تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آکر مال کا جائزہ لیں گے اور ایک ایک چیز کو اچھی طرح غور وفکر سے دیکھیں گے؛ لیکن دیکھتے ہیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور ایک نگاہ بھی اٹھا کر مال کی طرف نہیں دیکھا؛ بل کہ سیدھا محراب کے اندر تشریف لے گئے اور نماز پڑھائی، اس کے بعد مصلیوں کی طرف چہرہ کرکے بیٹھ گئے اور پوچھا کہ تم لوگ مختلف محلوں کے یہاں جمع ہوگئے، شاید تم لوگوں کو یہ خبر ملی ہوگی کہ بحرین سے مال آیا ہے؛ اس لیے تم لوگ یہاں جمع ہوگئے ہو؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا، ہاں یارسول اللہ! ہم اسی لیے جمع ہوئے ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پچھلی امتیں جو تباہ وہلاک ہوئیں، وہ مال ودولت میں غرق ہونے کی وجہ سے ہلاک ہوئیں، مجھے کوئی خوف تمہارے فقر وفاقے کا نہیں ہے، اگر مجھے کسی بات کا خوف تمہارے بارے میں ہے، تو یہی کہ دنیا تمہارے اوپر وسیع کردی جائے اور تم ایک دوسرے سے آگے بڑھنے میں مسابقت (race) کروگے اور ہلاک کردیے جاؤگے، پھر اس کے بعد مال کے پاس تشریف لائے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تقسیم کرنا شروع کرو، جس کو جس چیز کی ضرورت ہو دیتے چلے جاؤ، حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ تقسیم کرتے رہے یہاں تک کہ جو کچھ آیا تھا سب تقسیم ہوگیا، جب اللہ کے نبی

صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم وہاں سے اٹھے ہیں، تو یوں اپنا دامن جھاڑ کر اٹھ گئے کہ ایک پائی بھی اپنے لیے نہیں رکھی۔ (بخاري: ۱/۷۴۴، مسلم: ۲/۷۰۴)

یہ اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا اسوہ ہے کہ اتنے مال کی فراوانی کے باوجود ایک نگاہ بھی اٹھا کر آپ نے نہیں دیکھی اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے دلوں میں جو تھوڑی سی محبت جمع ہوگئی تھی، اس کو بھی کھینچ کر نکال دیا۔

اسی طرح ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک موقعے پر آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے نمازِ عصر پڑھائی، نماز کے بعد آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم لوگوں کو پھلانگتے ہوئے بڑی تیزی کے ساتھ گھر گئے، حضرات صحابہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پریشان ہیں کہ اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو کیا ضرورت پیش آگئی کہ آپ دوڑتے ہوئے اور لوگوں کو پھلانگتے ہوئے گھر تشریف لے گئے؟.......کچھ دیر بعد واپس آئے اور دیکھا کہ ان حضرات کو تعجب ہو رہا ہے تو صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ نماز میں مجھے یاد آیا کہ میرے گھر میں ایک سونے کا ٹکڑا رہ گیا ہے، میں نے یہ مکروہ سمجھا کہ وہ مجھے مشغول کر لے، ایک روایت میں یوں فرمایا کہ کہیں وہ میرے پاس رات میں رہ نہ جائے؛ لہٰذا میں نے اس کو تقسیم کرنے کا حکم دی دیا ہے۔

(بخاري: ۸۵۱، نسائي: ۱۳۶۴)

یہ تھے اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کہ آپ کے دل میں دنیا کی کوئی محبت نہیں تھی، اب اللہ کے نبی کا دل دیکھو کہ کیسا تھا، میں یہ سمجھانا چاہ رہا ہوں کہ نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ذات میں تمھارے لیے نمونہ موجود ہے، آپ کے دل کو دیکھ کر اپنا دل بھی ویسا ہی بنا لو۔

اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے دل میں خوفِ الٰہی

ایک صفت ہمارے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے دل کی یہ تھی کہ آپ کے دل

میں خدا کا خوف بے پناہ موجود تھا۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شدید بھوک لگی اور کھانے کے لیے کچھ بھی موجود نہیں تھا، آپ گھر کے باہر تشریف لائے، دیکھا تو ایک طرف صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نظر آئے، دوپہر کی شدید گرمی کا وقت تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا: ''اے ابوبکر! ایسے وقت کیوں باہر آگئے؟ تو انھوں نے کہا کہ یارسول اللہ! بھوک کی شدت نے باہر نکلنے پر مجبور کیا؛ اس لیے باہر نکل آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے بھی بھوک نے ہی مجبور کیا؛ اس لیے میں بھی باہر نکل آیا ہوں، دونوں حضرات کچھ آگے بڑھے، تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نظر آئے، ان سے پوچھا کہ اس وقت باہر کیوں؟ تو انکا بھی وہی عذر کہ بھوک کی شدت نے مجبور کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چلو ابوالہیثم کے باغ میں چلیں گے، یہ ایک صحابی تھے، ان کا مدینے کے اندر بڑا باغ تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لے گئے، اس وقت ابوالہیثم وہاں موجود نہیں تھے، ان کی بیوی موجود تھیں، انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، تو وہ خوش ہوگئیں، چادر بچھائیں، اس کے بعد کھانے کے لیے انگور وغیرہ لا کر رکھ دیا، حضور اور صحابہ نوش فرمارہے تھے، اتنے میں حضرت ابوالہیثم بھی آگئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے، ان کی تو عید ہوگئی، ان کے پاس ایک بکری موجود تھی، اس کو جلدی سے ذبح کیا، اور اس کو بھونا، بیوی کو حکم دیا کہ روٹی پکاؤ، گرم گرم روٹیاں پکا دی گئیں، سالن بھی تیار ہوگیا، لاکر حضور کے سامنے رکھ دیا، حضور نے بھی کھایا اور دیگر اصحاب نے بھی کھایا، فراغت کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رونا شروع کر دیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر سب کو رونا آگیا اور ایک کہرام سا مچ گیا؛ لیکن کسی کو کچھ نہیں پتہ کہ کیوں رویا جارہا ہے؟ اللہ کے نبی کے رونے کو دیکھ کر سب کو رونا آگیا،

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ سے پوچھا کہ یا نبی اللہ! آپ کیوں رو رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ ابوبکر! جو بھی ہم نے کھانا کھایا ہے، قیامت کے میدان میں ان میں سے ایک ایک چیز کا ہمیں جواب دینا ہے؛ اس لیے رو رہا ہوں۔ (ترمذي: ۲/۶۲)

ہمارا حال تو یہ ہے کہ صبح کھا رہے ہیں، شام کھا رہے ہیں، تین تین وقت کھا رہے ہیں، اس کے علاوہ بھی کبھی لسی، کبھی چائے، اس کے باوجود ہمارے دلوں میں اللہ کا کوئی خوف نہیں ہے، جب اللہ کے نبی رو رو کر یہ آخری جملہ ادا کر رہے تھے، تو سب کے دل میں عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔

اس لیے بھائیو! نبی کے جیسا دل بناؤ، اللہ کا خوف دل میں پیدا کرو اور اللہ کی محبت دل میں پیدا کرو، واقعات تو بہت ہیں؛ لیکن ایک (point) جو اس وقت میں نے اٹھایا ہے، میں ضروری سمجھتا ہوں کہ کم از کم اس نکتے پر مجھے اور آپ کو اچھی طرح غور وخوض کر کے اس کے لیے اپنے آپ کو تیار کر لینا چاہیے کہ ہمارا دل تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسا بن جائے، آج وہی فکر، وہی خوف ہمارے اندر پیدا ہو، تو انشا اللہ ہماری پوری زندگی میں تبدیلی پیدا ہو جائی گی؛ اس لیے کہ اصل تو دل ہی ہے، تمام اعضا جو بنتے ہیں، وہ دل ہی سے بنتے ہیں۔

آپ کے دل میں تعلق مع اللہ کی کیفیت

اسی طرح ایک اور بات سن لیجیے! جو بہت اہم ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں اللہ سے تعلق کی جو کیفیت تھی، وہ بے مثال و بے نظیر تھی۔ یہ بھی ایک چیز ہے، جس کو ہمیں اپنے نبی کے اسوہ سے لینا اور سیکھنا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں آتے تھے، تو گھر کے کام کاج کرتے تھے اور جیسے ہی اذان ہوتی یا نماز کا وقت ہوتا،

تو نماز کے لیے نکل جاتے۔

(بخاري: ٦٧٦، ترمذي: ٢٤٨٩، الأدب المفرد: ١/ ٢١٥)

مطلب یہ ہوا کہ آپ ﷺ کا معمول تھا کہ گھر میں کام کاج میں شریک ہوتے اور ازواجِ مطہرات کے ساتھ ہنسی مذاق بھی فرماتے تھے اور جیسے ہی اذان کی آواز آتی تھی، تو پھر آپ سب کام چھوڑ کر نماز کی طرف اور اللہ کی جانب متوجہ ہو جاتے تھے۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ "ترک جميع عمله، و كأنه لم يعرف أحدا من أهله" کہ آپ سب کاموں کو چھوڑ دیتے گویا کہ آپ اپنے اہل میں سے کسی کو جانتے پہچانتے ہی نہیں۔

(المرقاة: ١٠/ ٤٨٧)

حالانکہ آپ کا گھر میں ایک معمول یہ بھی تھا کہ آپ اپنی ازواج کے ساتھ ہنسی مزاح بھی کیا کرتے تھے۔

جیسے حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے مکان میں تھے، انھوں نے حضور ﷺ کے لیے حریرہ گھر میں تیار کیا اور لے آئیں، کہنے لگیں: "اے اللہ کے نبی! میں نے یہ آپ کے لیے تیار کیا ہے، اس کو کھائیے، یہاں حضرت سودہ رضی اللہ عنہا بھی حاضر تھیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان سے کہا: تم بھی کھاؤ؛ لیکن حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں تو نہیں کھاؤں گی، وہ روٹھ گئیں؛ لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اصرار کیا کہ تمھیں کھانا پڑے گا، یہ اصرار و انکار اتنا بڑھتا گیا کہ دونوں کے درمیان میں بات ذرا آگے بڑھ گئی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ اگر تم اسے نہیں کھاؤ گی، تو میں یہ کھانا تمہارے منھ پر مل دوں گی؛ یعنی ایک مذاق اور تفریح کا موقعہ تھا۔

چناں چہ انھوں نے حریرہ میں ہاتھ ڈال کر ان کے منھ پر مل دیا، حضور

صلی اللہ علیہ وسلم بازو بیٹھے ہوئے ہنس رہے تھے، مسکراہٹ آپ کے چہرے پر کھیل رہی تھی، جب حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو دیکھا کہ ان کا پورا چہرہ کھانے سے ملوث ہوگیا ہے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ عائشہ نے تمھارے منھ پر یہ لگایا ہے، اب میں ان کے ہاتھ پکڑ لیتا ہوں، تم ان کے منھ پر یہ مل دو؛ چناں چہ حضرت عائشہ کے ہاتھوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پکڑ لیا، تو حضرت سودہ نے حریرہ اٹھا کر ان کے منھ پر مل دیا اور پھر ایک ہنسی کا موقعہ فراہم ہو گیا۔

(حیاۃ الصحابہ: ۲/۷۹۹)

یہ تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کا ماحول بیویوں کے ساتھ اور اسی کے ساتھ جب اللہ کی طرف سے بلاوا آجاتا، تو نماز و ذکر کی جانب توجہ کا یہ عالم، جو آپ نے سنا؛ یہ ہے خدا کی محبت، ایک طرف بیویوں کا حق بھی ادا کر رہے ہیں؛ لیکن اسی کے ساتھ جب اللہ کا پیغام آتا تھا، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اب ہمارے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی تعلق نہیں، یہ اللہ کی محبت ہے، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سینے میں موجود تھی۔

دل کو گندگیوں سے پاک کرو۔ ایک واقعہ

الغرض! دل تو اللہ نے اسی لیے بنایا ہے کہ اس میں اللہ کی محبت پیدا کی جائے اور ہمارے دلوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل جیسا بنایا جائے، دل میں محبت الٰہی کی جگہ کوئی اور چیز آجائے، تو اللہ کبھی اسے برداشت نہیں کریں گے۔ مجھے ایک بات یاد آگئی، میں نے چند دن پہلے اپنے دوستوں کو سنایا تھا، غالباً دو یا تین ہفتے پہلے مجھ سے فون پر کچھ لوگوں نے رابطہ کیا اور کہا کہ یہاں ایک مکان ہے اور ایک بھائی بہن اس مکان میں رہتے ہیں، اس کے اندر غلاظتیں ہی غلاظتیں جمع ہیں، ہم محلے

کے کچھ لوگ مل کر اس مکان کے اندر سے وہ گندگیاں اور غلاظتیں باہر نکال کر پھینک دینا چاہتے ہیں، تو کیا شرعاً ہم کو اس کی اجازت ہے؟ (مسئلہ پوچھ رہے تھے)

میں نے جواب دینے سے پہلے ان سے تفصیل پوچھی، کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟ تاکہ تفصیل مجھے معلوم ہوجائے، تو انھوں نے جو تفصیل بتائی تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے، انھوں نے کہا کہ ایک صاحب ہیں جو پہلے Educational Department میں بڑے آفیسر تھے، بعد میں ان کا دماغ خراب ہوگیا، بچے اور بیوی سب ان کو چھوڑ کر چلے گئے، ان کی ایک بہن ہے، اس کا بیماریوں میں عجیب وغریب بُرا حال ہے، نہ اٹھ سکتی ہے، نہ کچھ کام کرسکتی ہے، نہ کچھ بول سکتی ہے، اپنے بیڈ پر پڑی ہوئی ہے، پیشاب وہیں، پاخانہ وہیں، کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں، بھائی کا حال یہ ہے کہ دماغ خراب ہونے کی وجہ سے راستہ چلتے ہوئے راستے میں جتنی گندگیاں اور غلاظتیں ہوتی ہیں، وہ چن چن کر لاتا اور اپنے گھر میں جماتا ہے، کاغذ پڑا ہے، وہ لاکر گھر میں ڈال رہا ہے، کوئی اخبار پڑا ہوا ہے، اسے اٹھاکر لا رہا ہے، کوئی لوہے کی چیز ملی اسے اٹھاکر گھر میں ڈال رہا ہے، کوئی پتھر ملا اسے اٹھاکر گھر میں ڈال رہا ہے، غرض یہ کہ چلتے پھرتے ہزاروں قسم کی اچھی بری چیزیں ملتی ہیں، دماغ خراب ہونے کی وجہ سے گھر میں لالاکر ڈالتا چلا جارہا ہے، یہاں تک کہ جو اس کا پلنگ ہے، پلنگ پر بھی یہی سب کچھ رکھا ہوا ہے، وہ خود تو نیچے سوتا ہے اور پلنگ کے اوپر یہ سب جمع کرتا ہے اور پھر یہ چیزیں رکھے رکھے کبھی پانی پڑ گیا یا کچھ اور ہوگیا اور وہ چیزیں خراب ہونے لگیں، سڑنے لگیں، اس طرح پورے گھر میں سوائے غلاظت، گندگی اور بدبو کے اور کچھ نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم اس گھر کو خالی کرنا چاہتے ہیں؛ مگر ان صاحب کی اجازت نہیں ہے اور وہ صاحب

اسے خالی کرنے کے لیے تیار نہیں اور وہ بہت مزاحمت کررہے ہیں کہ تم لوگ ہمارے گھر میں کیوں آئے ہو؟ اور کیوں ان چیزوں کو نکال رہے ہو، یہ میری چیزیں ہیں، یہ اخبار مجھے کام آئے گا، پچیس سال پہلے کا اخبار بھی پڑا ہے، بیس سال پہلے کا بھی اخبار پڑا ہے اور وہ اسے پھینکنے کے لیے تیار نہیں۔

میں نے کہا کہ جب یہ صورت حال ہے اور آپ لوگ ان کے گھر کو خالی کرنا چاہتے ہیں اور اس کا مقصد دراصل ان کے گھر کو پاک کرنا ہے اور بے کار و بے ہودہ چیزوں سے خالی کرنا ہے، تو یہ شرعاً جائز ہے؛ اس لیے کہ نکالنے کی چیز کو نکالنا تو گناہ نہیں ہے، کسی کے گھر کو صاف کرنا کوئی جرم نہیں؛ یہ الگ بات ہے کہ وہ صاحب اپنی بے وقوفی کی وجہ سے اس کو سمجھیں کہ یہ غلط کام ہے۔

بھائیو! بزرگو! مجھے اس واقعے سے بتانا کیا ہے؟ یہ بتانا ہے کہ جیسے ایک اچھے گھر میں اچھی چیزیں رکھنے کے بجائے گندگی، غلاظت کوئی جمع کرتا ہے، تو دنیا کا کوئی انسان اسے برداشت نہیں کرتا؛ بل کہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس کے دماغ کے اندر خرابی ہے اور واقعی خرابی بھی ہوتی ہے؛ اسی طرح جو اپنے دل کے محل کو خدا کی محبت سے سجانے کے بجائے دنیا کی غلاظتوں سے ملوث کر لیتا ہے، تو آپ بتائیے کہ اس کے بارے میں کیا کہا جائے، ہمارے نبی حضرت محمد رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی سیرت کے اندر ہم کو یہی درس دیا گیا ہے کہ اس دل کو کیسے سجائیں؟ پاک کریں؟

نجس دل میں اللہ کی تجلی نہیں ہوتی

یاد رکھو! کہ دل کی خرابی بہت بڑی خرابی ہے؛ اس لیے وہاں گندگی ڈالنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، کیا اپنی آفس روم میں کوئی گندگی، غلاظت ڈالے گا؟ جہاں سارے لوگ آتے جاتے ہوں، میل ملاقات وہیں ہوتی ہو، صوفہ رکھا ہوا ہو، فرنیچر

ہو،ٹیبل رکھا ہوا ہو،ان کے اوپر چار پانچ جگہ گندگی اور غلاظت ڈال دی جائے۔ سوچو کہ کون آئے گا آپ کے آفس میں یا ایسے گھر میں؟

اسی طرح اس گھر (دل) میں،جس کے اندر گندگیاں اور غلاظتیں ڈال دی گئی ہوں ،وہاں خدا کیسے آ سکتا ہے؟ نجس دل میں کبھی اللہ کی تجلی نہیں آتی ،جس میں اخلاقی و اعتقادی ،نظریاتی و دیگر رذائل و خبائث ہوں ۔آج یہی ہمارا روگ ہے، سب سے بڑی مصیبت ہے ،سب سے بڑا المیہ ہے کہ ہم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کے اسوۂ حسنہ سے دل کے بنانے کا فن نہیں سیکھا،دل کو سجانے کا فن نہیں سیکھا۔

دنیا والوں سے عبرت لیجیے!

بھائیو! ہمیں اس سلسلے میں دنیا والوں سے عبرت لینا چاہیے! آج دنیا ترقی کرتے کرتے کہاں سے کہاں پہنچ رہی ہے،وہ ترقی کرتے کرتے اپنے گھروں کو سجانے کے لیے کیا کیا انداز اختیار کر رہی ہے، ہر کام کے لیے الگ الگ آدمی موجود ہیں،مختلف قسم کے ڈیزائن ہوتے ہیں ، اندرونی کام (Interior)اور باہری کام(Exterior)اور ہر ایک کے لیے الگ الگ اشخاص ہوتے ہیں (Interior) کام کی مخلوق الگ،وہ لوگ صرف اندرونِ خانہ کام کرتے ہیں،ان کا کام باہر کا نہیں ،اور(Exterior) کام والے باہر کا کام کرتے ہیں، یہ لوگ اندر کا کام نہیں کرتے ،صوفے والے ٹیبل کا کام نہیں کرتے ،ٹیبل والے صوفے کا کام نہیں کرتے ،کارپیٹ بچھانے والے چھت پر ڈیزائننگ کا کام نہیں کرتے ،ہر ایک کے لیے الگ الگ قسم کے لوگ ہیں اور ہر ایک اپنے فن کا فن کار ہے اور ہر ایک اپنا فن دکھا رہا ہے اور لوگ ہر ایک سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے گھروں کو، اپنی

آفسوں کو سجا رہے ہیں کہ ہمارا گھر ایسا ہونا چاہیے، ہماری آفس ایسی ہونی چاہیے، ہمارا دکان ایسا ہونا چاہیے؛ لیکن افسوس یہ ہے کہ اگر سجاوٹ نہیں ہورہی ہے، تو اس دل کے گھر کی نہیں ہورہی ہے، جو خالقِ کائنات ''اللہ تعالیٰ'' نے اپنے لیے بنایا ہے، کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے؟ ہمارے رہنے کے مکانات تو اتنے عالیشان ہوں اور اللہ کا مکان ''دل'' اتنا گھٹیا اور اتنا گندا ہو کہ مت پوچھو۔ ساری غلاظتیں اس میں، حسد اس میں، کینہ اس میں، تکبر اس میں، بغض اس میں، مردار دنیا کی محبت اس میں، بے حساب گندگیاں اس میں۔

مرشدی شاہ ابرار الحق صاحب رَحِمَہُ اللہُ کا ایک مقولہ

حضرت مرشدی مولانا شاہ ابرار الحق صاحب رَحِمَہُ اللہُ ، بار بار ایک جملہ ارشاد فرمایا کرتے تھے، وہ جملہ یاد آ گیا، حضرت وہ جملہ قرآن و اذان و نماز کے بارے میں فرمایا کرتے تھے، کہتے تھے کہ ''قرآن آج لوگوں کا بڑھیا نہیں ہے، اذان بڑھیا نہیں ہے'' اور کہتے تھے ''کھانا بڑھیا، پانی بڑھیا، مکان بڑھیا، دکان بڑھیا، حتیٰ کہ پان بھی بڑھیا؛ لیکن قرآن بڑھیا نہیں''، یہ جملہ ہے حضرت کا۔

میں کہتا ہوں کہ اسی طرح دنیا بھر کے دکان، دنیا بھر کے مکان سب عالی شان، ان کے اندر و باہر تمام سجاوٹوں کا ہم اہتمام کرتے ہیں؛ لیکن خدا کے دل کو بسانے اور سجانے کا کوئی اہتمام نہیں، محمد صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی سیرت میں دل کو سجانے کا بہت زیادہ اہتمام ہے، یہ فن وہاں سے سیکھنا ہے۔

اس کو آپ سجائیں کیسے؟ اس کو سجانے کے لیے کیا کرنا پڑے گا؟ اللہ کا ذکر، اللہ کے ذکر سے اللہ کے دل کی سجاوٹ ہوتی ہے،'' سبحان الله'' پڑھیں ، ''الحمدلله'' پڑھیں،'' الله اکبر'' پڑھیں ،''لااله الاالله'' پڑھیں، اور ذکر

واذکار کریں، قرآن پاک کی تلاوت کریں، تو جوں جوں آپ قرآن پاک کی تلاوت اور ذکر واذکار کرتے جائیں گے، تو اس اللہ کے گھر میں بیل بوٹے لگتے چلے جائیں گے، "سبحان الله" سے ایک پھول نکلے گا، " الحمدلله " سے ایک پھول نکلے گا۔

ذکر اللہ سے معرفت ومحبت کا عکس دل پر پڑے گا-ایک واقعہ

جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں، اللہ ان کے دل میں بسیرا کرتا ہے، کیسا بسیرا؟ ایک عجیب وغریب واقعہ سنیے! آپ نے مہدوی فرقے کا نام سنا ہوگا، اس فرقے کے بارے میں تمام علما کا کہنا ہے کہ یہ گمراہ فرقہ ہے اور کافر ہے۔ اب رہی اس کی تفصیلات، تو اس وقت کہنا نہیں ہے، اس فرقے کے جو بانی تھے، وہ بانی بنا لیے گئے ہیں، وہ خود شاید بانی نہ ہوں، لوگوں نے ان کو بانی قرار دے لیا ہے۔ بہر حال! یہ لوگ ان کو مانتے ہیں، ان کا نام ہے "محمد جونپوری" جونپور (یو، پی) کے رہنے والے تھے، ان کے بارے میں مورخین کی رائے مختلف ہے، بعض کہتے ہیں کہ یہ غلط قسم کے آدمی تھے، لوگوں کو ایک گمراہی پر ڈال گئے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ صوفی منش آدمی تھے، اللہ والے تھے۔ بہر حال! وہ جیسے بھی تھے، اس وقت اس کی بھی بحث نہیں ہے؛ البتہ ان کا ایک واقعہ سنانا ہے، وہ یہ کہ انھوں نے اپنے کچھ لوگوں کے ساتھ غیروں سے جہاد کرنا شروع کیا، مختلف جگہ ان کی فوجیں جاتی تھیں اور جہاد کرتی تھیں؛ تاریخ میں یہ واقعہ لکھا ہوا ہے کہ ایک جگہ "راجا دلیپ راؤ" اور راجا کی فوج سے ان کی مُڈ بھیڑ ہوئی اور آپس میں دونوں کا مقابلہ ہوا اور اس مقابلے میں سید جونپوری نے بادشاہ کے اوپر حملہ کیا، وار کاری تھا، راجا گرا اور گر کر مر گیا، یہاں تک کہ اس کا سینہ پھٹ کر دل باہر نکل آیا، جب اس کا دل نکل کر باہر آ گیا، تو لوگوں نے ایک عجیب

وغریب بات یہ دیکھی کہ اس کے دل کے اوپر اس مورتی کی تصویر تھی، جس کی وہ پوجا کیا کرتا تھا، اس طرح جیسے چھپی ہوئی تصویر ہوتی ہے۔اس کا کیا مطلب ہوا؟ مطلب یہ کہ جب وہ کافر بادشاہ پورے دھیان وتوجہ کے ساتھ اپنی مورتی کی پوجا کرتا تھا، تو دل نے اس کا عکس قبول کرلیا۔

بھائیو! ذرا سوچو کہ جو خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوگا، تو کیا خدا تعالیٰ کی معرفت ومحبت کا عکس اس کے دل پر نہیں آئے گا؟ کیوں نہیں؟ ایک عربی شاعر نے کہا ہے:

لِيْ حَبِيْبٌ خَيَالُهٗ نُصْبَ عَيْنِيْ
وَ اسْمُهٗ فِيْ ضَمَائِرِيْ مَكْنُوْن

إِنْ تَذَكَّرْتُهٗ فَكُلِّيْ قُلُوْبٌ
وَ إِنْ تَأَمَّلْتُهٗ فَكُلِّيْ عُيُوْنٌ

یعنی میرا ایک محبوب ومعشوق ہے، جس کا تصور وخیال ہمیشہ میری آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے اور اس کا نام میرے ضمیر (دل) میں پوشیدہ ہے؛ اگر میں اس کو یاد کرتا ہوں، تو میں سراپا دل ہو جاتا ہوں اور اگر میں اس کو دیکھتا ہوں، تو سراپا آنکھ بن جاتا ہوں۔

لہٰذا اللہ کو، اللہ کی محبت کو اپنے دل میں بسانے کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کا ذکر کرو، اس کی طرف دھیان لگاؤ، اس کی طرف محبت کے ساتھ متوجہ ہو جاؤ، جب یہ کام کریں گے، تو ان شاء اللہ! یہ دل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے مطابق اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوے کے مطابق اللہ کا واقعی مسکن بنے گا اور اس مسکن میں خدا کی محبت رہے گی، پلے گی، پھلے گی، پھولے گی۔

حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ بھی اُسوہ ہے

اسی طرح ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں بھی ہمارے لیے اسوہ و

نمونہ ہیں۔ کس طرح؟ اس طرح کہ ہم یہ دیکھیں کہ آپ کی آنکھیں کہاں اور کس طرح استعمال ہوتی تھیں؟ آپ راستوں میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے نہیں چلتے تھے؛ بل کہ نگاہیں آپ کی نیچے کی جانب ہوتی تھیں۔

(طبقات ابن سعد: ۱/ ۳۷۹،سبل الهدیٰ والرشاد: ۸/ ۱۵۹)

آپ کسی حرام وناجائز چیز کونہیں دیکھتے تھے، کسی نامحرم پر نگاہ نہیں اٹھاتے تھے؛ نیز آپ کی آنکھیں اللہ کی محبت یا خوف سے روتی تھیں۔ ایک بار سورج گرہن ہو گیا، تو آپ نے نمازِ کسوف پڑھائی اور لمبا لمبا رکوع اور لمبا لمبا سجدہ کیا اور سجدے میں روتے روتے کہتے جارہے تھے: (اے اللہ! کیا آپ نے مجھ سے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ میں جب تک ان لوگوں میں موجود ہوں آپ ان کو عذاب نہیں دیں گے) یہ کہتے جاتے اور روتے جاتے تھے (شمائلِ ترمذی: حدیث:۳۱۵)

ایک بار حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم مجھے قرآن سناؤ، انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا میں آپ کو قرآن سناؤں؛ جب کہ قرآن آپ پر نازل ہوا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ کسی اور سے قرآن سنوں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے قرآن پڑھنا شروع کیا اور سورۂ نساء پڑھی۔ وہ کہتے ہیں کہ جب میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو: " رأيت عيني رسول الله تهملان" (دیکھا کہ رسول اللہ کی آنکھیں بہہ رہی ہیں)

(شمائل:۳۱۴)

ساری چمک دمک توانہی موتیوں سے ہے
آنسو نہ ہوں، تو عشق میں کچھ آبرو نہیں!

ہر چیز پر عبرت کے لئے نگاہ ڈالتے تھے، فضول و بے کار کسی چیز کو دیکھتے نہیں تھے۔ یہ ہے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں کو اسوہ بنانا؛ لہٰذا اس کے

مطابق اپنی آنکھوں کو بنانا چاہیے۔

زبانِ نبوی اور اسوۂ حسنہ

اسی طرح مثال کے طور پر زبان کو لیجیے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان کہاں اور کس طرح استعمال ہوتی تھی؟ آپ نہ اس کو گالی بکنے میں استعمال کرتے تھے، نہ کسی بری بات میں استعمال کرتے تھے، نہ کسی کو اس سے اذیت پہنچاتے تھے؛ بل کہ یہ زبان یا تو اللہ کا کلام پڑھنے میں یا ذکر اللہ میں یا کسی کو اچھے امور کی تعلیم و تبلیغ میں، وعظ و نصیحت میں استعمال ہوتی تھی؛ لہٰذا ہمیں بھی اپنی اپنی زبان کا استعمال صحیح طریقے کے مطابق اسوۂ حسنہ کی روشنی میں کرنا چاہیے۔

الغرض! یہ چند مثالیں اور اشارے ہیں، ان سے اندازہ ہو جائے گا کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمیں کس طرح اسوۂ حسنہ بنانا ہے۔ ہر ہر بات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نمونہ بنانا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمیں بھی عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

معرفتِ الٰہی
اور
اس کے آثار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معرفتِ الٰہی اوراس کے آثار

الحمدللّٰہ و کفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ . أمابعد:

فأعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم ، بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ﴾ (الذریٰت:۵۶)

محترم حضرات !

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انسان کوبھی پیدا کیا اور دیگر مخلوقات کوبھی پیدا کیا؛ مگر علما نے لکھا ہے کہ انسان کے پیدا کرنے اور دیگر مخلوقات کے پیدا کرنے میں ایک بڑا فرق ہے؛ وہ یہ کہ انسان کی تخلیق کا مقصد اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے اور دیگر مخلوقات کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اللہ کی معرفت کا انسان کے لیے ذریعہ بنیں۔ زمین اللہ کی معرفت کا ذریعہ ہے، آسمان اللہ کی معرفت کا ذریعہ ہے، چاندوسورج اللہ کی معرفت کا ذریعہ ہیں، درخت کو اللہ نے اس لیے نہیں پیدا کیا ہے کہ درخت کو اللہ کی معرفت ہو اور نہ جانوروں کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ جانور اللہ کے عارف بندے بن جائیں؛ عارف تو بنے گا وہ بندہ، جس کو انسان کہتے ہیں؛ اسی لیے زمین کے متعلق ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اللہ کی عارف ہے، آسمان کو اللہ کا عارف نہیں کہہ سکتے، شجر وحجر کو اللہ کا عارف نہیں کہہ سکتے، چرند پرند کو اللہ کا عارف نہیں کہہ سکتے، ان کو معرفت نصیب نہیں ہے، معرفت اللہ تعالیٰ نے صرف انسان اور جنات کو عطا کی ہے۔

قرآن کریم کی جو آیت میں نے تلاوت کی ہے، اس میں اسی طرف اشارہ

ہے؛ چناں چہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ (میں نے جنات اور انسانوں کو صرف میری عبادت کے لیے پیدا کیا ہے) (الذاریت: ۵۶)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ وحضرت مجاہد رحمہ اللہ کی تفسیر

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ان کے شاگرد حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے " لیعبدون " کی تفسیر " لیعرفون " سے کی ہے؛ یعنی عبادت سے مراد یہاں اللہ کی معرفت اور پہچان ہے؛ چناں چہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے "سبحان الذی أسری الخ" کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے آیت: "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ" کی تفسیر "الا لیعرفون" سے کی ہے۔

(روح المعاني: ۱۵/۱۵)

اور حضرت مجاہد رحمہ اللہ سے یہ تفسیر متعدد حضراتِ مفسرین نے نقل کی ہے، جیسے "امام ابوحیان" نے " البحر المحیط" میں، "علامہ آلوسیؒ" نے "روح المعاني" میں، "ابنِ عادل" نے "اللباب" میں اس کا ذکر کیا ہے۔

(البحر المحیط: ۱۰۹/۸، روح المعاني: ۱۵/۱۵، اللباب: ۴۶۸۰/۱)

الغرض! یہاں اللہ تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ بندے میری معرفت حاصل کریں، اس لیے انسان وجنات کو پیدا فرمایا گیا۔

معرفت کو عبادت سے تعبیر کرنے میں حکمت

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "لیعبدون "کیوں فرمایا؛ جب کہ مقصود "لیعرفون " ہے؟ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ اللہ کی معرفت کا ذریعہ عبادت ہے، اگر اللہ کی معرفت پیدا کرنا ہے، تو اس کا وسیلہ اور ذریعہ ہی اللہ کی

عبادت ہے؛ لہٰذا اللہ کی عبادت کے بغیر اگر کوئی معرفت کا دعویٰ کرتا ہے، تو وہ جھوٹا ہے، اس کی جانب اشارہ کرنے کے لیے معرفت کو عبادت سے تعبیر فرمایا گیا۔

اس میں ان جیسے لوگوں کا رد ہو گیا، جو آج کل معرفتِ خداوندی کا دعویٰ کرتے ہیں؛ لیکن عباداتِ خداوندی سے عاری و خالی ہوتے ہیں۔ نہ نماز ہے، نہ روزہ ہے، نہ زکوۃ ہے، نہ سنت کی پابندی ہے، نہ ذکر ہے، نہ تسبیح ہے، دن رات اللہ کی نافرمانی ہے، پھر بھی معرفت کا دعویٰ ہے، نماز وہ نہیں پڑھیں گے، کہیں گے: ''ہم دل کی نماز پڑھتے ہیں''، ذکر وہ نہیں کریں گے، کہیں گے: ''ہمارا دل ہر وقت ذاکر و شاغل رہتا ہے''، زکوۃ وہ نہیں دیں گے، کہیں گے: ''زکوۃ سے مراد طہارت ہے، وہ ہمیں حاصل ہے''؛ اس طرح تمام عبادات اور شرعی احکامات کے اندر تاویل کی راہ اختیار کرتے ہیں اور گمراہی میں پھنس جاتے ہیں؛ اس لیے اللہ تعالیٰ، جو علام الغیوب ہیں، جسے ساری کائنات کا علم ہے، اسے یہ بھی معلوم ہے کہ لوگ کیسی کیسی تاویلیں کریں گے؛ اس لیے قرآن میں خود ان کا علاج ذکر کر دیا کہ اگر تم بغیر عبادت کے معرفتِ خداوندی کا دعویٰ کرتے ہو، تو تم جھوٹے ہو۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں بھیجا، آپ دنیا میں سب سے بڑے عارف، سب سے زیادہ اللہ کو پہچاننے والے، اللہ کے نبی نے خود ہی فرمایا ہے: " **إنَّ أتقاكم و أعلمكم بالله أنا** " کہ تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اللہ کی معرفت رکھنے والا میں ہوں۔ (بخاری: ۲۰)

اس کی وجہ یہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑے عارف باللہ تھے، اللہ تعالیٰ نے معرفت سمجھانے آپ کو مبعوث فرمایا، آپ سے اعمال کروائے، عبادات، نماز، روزہ زکوۃ، حج و قربانی، ذکر و اذکار وغیرہ کراوئے تا کہ دنیا والوں کو بتائیں کہ یہی راستہ ہے، جس پر چل کر اللہ کی معرفت نصیب ہوتی ہے۔

معرفت کی حقیقت

اب یہ سنیے کہ معرفت کسے کہتے ہیں؟ ''معرفت'' عربی کا لفظ ہے، لغت میں اس کے معنے ہیں ''جاننا پہچاننا''، شریعت وتصوف کی راہ میں معرفت سے مراد یہ ہے کہ اللہ کو اس طرح جانا جائے پہچانا جائے کہ اس جاننے پہچاننے کے آثار اپنی ذات پر ظاہر ہونے لگیں۔ اللہ نے انسان کو اسی لئے پیدا کیا ہے۔

لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ ہم اللہ کی ذات کو جان نہیں سکتے، تو پھر اللہ کو جاننے کا کیا مطلب ہے؟ جواب یہ ہے کہ اللہ کو جاننے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی صفات کو جانا جائے، دوسرے اللہ تعالیٰ کے افعال کو جانا جائے، تیسرے اللہ تعالیٰ کے شئون کو جانا جائے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنے افعال، اپنی صفات، اپنے شئون جگہ جگہ بیان فرمائے ہیں، انسان جب ان چیزوں کو جان لیتا ہے، تو کہا جاتا ہے کہ اس کو اللہ کی پہچان حاصل ہے، اسے معرفت کی دولت مل گئی ہے۔

ذاتِ خداوندی کی معرفت محال ہے

ابھی میں نے جو عرض کیا کہ اللہ کی ذات کو ہم نہیں جان سکتے، تو واقعی بات یہی ہے؛ اس لیے اللہ کی ذت کو جاننے کی کوشش نہ کرے؛ اس لیے کہ ذات کو جاننے کی کوشش کرے گا، تو ناکام ہو جائے گا؛ کیوں کہ اللہ کی ذات کو کوئی نہیں جان سکتا۔ ذات کو جاننے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ذات کے اعتبار سے کیسے ہیں؟ جیسے انسان کی حقیقت ذات کے اعتبار سے یہ ہے کہ وہ مٹی سے بنایا گیا ہے، اس کے اعضا اتنے ہیں، ان کے فلاں فلاں کام ہیں؛ اسی طرح دیگر مخلوقات کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہ کس چیز سے بنے ہیں، ان سب چیزوں کی پہچان ان کے مادے سے ہوتی ہے؛ لیکن اگر کوئی چاہے کہ مخلوقات کی طرح اللہ کی ذات کو جانوں، تو یہ

ناممکن بات ہے؛ اس لیے کہ اللہ کی ذات انسان کی عقل سے ماورا ہے، انسان کی عقل نہ وہاں پہنچ سکتی ہے، نہ اس دنیا میں اس کی آنکھ اسے دیکھ سکتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا: ﴿لَاتُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ﴾ (الأنعام: ١٠٤)

(اس کو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں) اور حدیث میں آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا ہے "تفکروا في خلق الله لا تتفکروا في الله" (اللہ کی مخلوق میں غور وفکر کرو، اللہ کی ذات میں غور وفکر نہ کرو) (جامع الأحادیث: ١٠٩٠١)

اسی لیے جب حضرت موسیٰ عَلَيْهِ السَّلَام اللہ کی طرف سے فرعون کے پاس بھیجے گئے اور آپ نے فرعون سے کہا کہ میں رب العالمین کی طرف سے رسول بن کر آیا ہوں، تو فرعون نے کہا: ﴿وَمَارَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (الشعراء: ٢٣) (رب العالمین کیا چیز ہے؟) یعنی ذات کے بارے میں پوچھ لیا، حضرت موسی عَلَيْهِ السَّلَام سمجھ گئے کہ اسے معرفت کی "الف، ب" بھی معلوم نہیں ہے؛ حالاں کہ معرفت کی "الف، ب" سے تو کوئی کافر بھی خالی نہیں۔

قرآنِ کریم میں ہے کہ جب کفار کی کشتی بھنور میں پھنس جاتی ہے، طوفان کی زَدْ میں آجاتی ہے، تو اس وقت وہ لوگ بھی اللہ ہی کو پکارتے ہیں، اپنے بتوں کو بھول جاتے ہیں، کیا مطلب ہوا؟ مطلب یہ ہوا کہ اللہ نے اپنی پہچان کافر کو بھی عطا کی ہے؛ لیکن فرعون ملعون اتنا نابلد و بے وقوف تھا کہ اسے بالکل اللہ کی پہچان نہیں تھی جس کی وجہ سے ایسا غلط سوال کیا کہ رب العالمین کیا چیز ہے؟ حالاں کہ پوچھنا چاہیے کہ "رب العالمین" کون ہے؟ جیسے آپ سے آکر کوئی پوچھے کہ آپ کیا چیز ہیں؟ تو آپ ہنسیں گے، یہ پوچھنا چاہیے کہ آپ کون ہیں؟

الغرض! حضرت موسیٰ عَلَيْهِ السَّلَام نے اس کے جواب میں فرمایا: ﴿رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ﴾ (وہ آسمانوں اور زمین

اوران کے درمیان کی سب چیزوں کا رب ہے؛ اگرتم یقین مانو)اورفرمایا:﴿ رَبُّكُمْ وَ رَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ﴾(اللہ وہ ہے، جو زمین اور آسمان کا رب ہے، تمھارااورتمھارے آباواجداد کا رب ہے) اورفرمایا:﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَآاِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ (وہ مشرق ومغرب اور ان کے درمیان کی چیزوں کا پروردگار ہے،اگرتم سمجھو) (الشعراء:۲۴،۲۶،۲۸)

یعنی اللہ کی صفات کو بیان فرمایا، اللہ کی ذات کو بیان نہیں کیا،اس سے بھی معلوم ہوا کہ اللہ کی ذات کوکوئی جان نہیں سکتا؛ لہٰذا معرفت کا حاصل یہ ہوا کہ اللہ کی صفات و افعال کے بارے میں قرآن و حدیث اور انفس و آفاق میں پھیلے ہوئے دلائل میں غور وفکر کرتے ہوئے اس کی پہچان پیدا کرنا۔

جھوٹے مدعیانِ معرفت کی بے راہ روی

بعض لوگ اس لفظِ معرفت کو بالکل غلط استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک شریعت والے ہیں ،ایک معرفت والے ہیں،ان سے پوچھا جائے کہ معرفت کیا ہے؟ تو کہتے ہیں یہ کان میں کہی جانے والی بات ہے،سب کونہیں بتائی جائے گی۔اللہ تو معرفت کوقرآن میں کھلے عام بیان کررہا ہے،احادیث میں ہمارے آقا حضرت محمد رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے کھلے عام بیان فرمایا ہے، تو یہ کون ہوتے ہیں، جو یہ کہیں کہ معرفت عام نہیں ہے،اللہ نے تو اس لیے عام کردیا تا کہ جو بندہ چاہے آسانی سے حاصل کرسکے اور جولوگ معرفت کوخاص کرتے ہیں،ان سے ہوتا کچھ نہیں صرف دعوے کرتے ہیں۔

ہرضروری چیز کواللہ نے عام رکھا ہے

دنیا میں اللہ تعالیٰ کا ایک اصول یہ ہے کہ انسان کوجس چیز کی جس قدر زیادہ

ضرورت ہے، اللہ نے اسے اسی قدر عام کیا ہے اور قیمتی بھی نہیں بنایا۔ مثلاً انسان کو کھانے کی زیادہ ضرورت تھی، اللہ نے اسے ہر جگہ عام کیا، دکان میں ملے گا، بازار میں ملے گا، ہر جگہ ملے گا؛ اسی طرح انسان کو پانی کی ضرورت کھانے سے بھی زیادہ ہوتی ہے؛ اس لیے اللہ تعالیٰ نے پانی کو کھانے سے بھی زیادہ عام کیا ہے اور اللہ نے ہر جگہ مفت رکھا ہے۔ ہم جو پانی کی بل دیتے ہیں، وہ اللہ کو نہیں دیتے؛ بل کہ پانی پہنچانے کا انتظام کرنے والوں کو دیتے ہیں، گورنمنٹ کو دیتے ہیں؛ اس لیے کہ انھوں نے اس اللہ کے پانی کو گھر گھر پہنچایا، تو ہم ان کو سروس چارج (SERVICE CHARGE) دیتے ہیں، یہ پانی کا چارج نہیں ہے، پانی کا سروس چارج ہے، پانی کا چارج کون دے سکتا ہے؟ اگر اللہ تعالیٰ پانی کا بل (bill) مانگنے لگیں، تو آپ کسی بِل میں گھس جائیں گے، پانی کا بل نہیں دے سکیں گے اور پانی سے زیادہ ضرورت انسان کو ہوا (OXYGEN) کی ہوتی ہے؛ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہوا کو اتنا عام کیا ہے کہ آپ جہاں میں جہاں بھی جائیں گے، وہیں ہوا آپ کا استقبال کرے گی، اس کا بھی کوئی بل کسی طور پر بھی نہیں لگتا، ایک انسان چوبیس گھنٹوں میں چوبیس ہزار دفعہ سانس لیتا ہے؛ یعنی ایک گھنٹے میں ایک ہزار دفعہ سانس لیتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ ایک گھنٹے کا بھی چارج کرتے، تو انسان کی حالت کیا ہوتی؟!!

اس کے برخلاف جس چیز کی ضرورت کم ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اسے خاص کرتے چلے جاتے ہیں، اس پر پابندیاں لگاتے چلے جاتے ہیں، پابندیاں لگاتے لگاتے اسے قیمتی بھی بنا دیتے ہیں، مقید کر دیتے ہیں، محبوس کر دیتے ہیں، مجور کر دیتے ہیں، اور قیمتی سے قیمتی بنا دیتے ہیں، جیسے ''ہیرا'' انسان کی ضرورت کا نہیں ہے؛ اس لیے اللہ

نے اسے اتنا قیمتی بنا دیا کہ عام آدمی اسے خرید نہیں سکتا اور محبوس بھی کر دیا، ہم میں سے بہت سارے لوگوں نے ہیرے کو دیکھا ہی نہیں ہوگا، اسی طرح سونا، موتی وغیرہ ہیں۔

اب اس اصول کو سامنے رکھ کر میں ایک بات سمجھانا چاہتا ہوں: وہ یہ ہے کہ اللہ کی معرفت انسان کو سانس سے زیادہ ضروری ہے، اس کے کھانے سے زیادہ ضروری ہے، اس کے پینے سے زیادہ ضروری ہے، اتنی زیادہ ضروری چیز کو کیا اللہ تعالیٰ خاص کر کے رکھ دیں گے کہ بعض لوگوں کو دے دیں اور کہیں کہ تم ہی اسے لیے پھرنا، صرف کان میں بولنا۔ ہو ہی نہیں سکتا، ناممکن بات ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے ضرورتِ انسانی کی اشیا کو کھلے عام پیش کر دیا ہے، اسی طرح معرفتِ الٰہی بھی ہماری روح کے لیے ضروری چیز ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے کھلے عام بیان فرمایا ہے، یہ کوئی مخفی اور پوشیدہ راز نہیں ہے۔

معرفتِ الٰہی کتنی عام ہے؟

اب میں آپ لوگوں کو بتاؤں گا کہ اللہ تعالیٰ نے معرفتِ الٰہی کو انسانی ضرورت کے پیشِ نظر کتنا عام کیا ہے؟ قرآن کریم کی ہر آیت کے اندر معرفت موجود ہے۔

واقعہ لکھا ہے کہ ایک آدمی مسلمان ہوا، اس سے پوچھا گیا کہ کس چیز نے تمھیں اسلام کی طرف مائل کیا؟ تو اس نے کہا: ''میں نے قرآن کریم پڑھا، تو معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی ہر آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کوئی نہ کوئی صفت بیان کی ہے، کہیں ''بصیر'' فرمایا ہے، تو کہیں ''خبیر''، کہیں ''علیم'' فرمایا ہے تو کہیں ''علام الغیوب'' وغیرہ۔ اس سے میں نے سمجھا کہ قرآن و اسلام دراصل اللہ کی معرفت کی تعلیم دیتے ہیں، اس کے برخلاف عیسائی اور دوسرے مذاہب میں خدا کا کوئی خاص تذکرہ نہیں، نہ اس کی صفات کا بیان ہے؛ اس لیے مجھے اسلام نے اپیل کیا اور میں مسلمان ہو گیا''۔

تو معلوم ہوا، ہر آیت میں معرفت کا سامان ہے، جو بھی قرآنِ کریم غور سے پڑھے گا، تو وہ ضرور بالضرور اللہ کا عارف بندہ بن جائے گا۔

دوسری طرف احادیثِ نبوی بھی معرفت سے بھری پڑی ہیں، تیسرے یہ کہ اللہ نے ساری دنیا کی ہر چیز کو معرفت کا سامان بنا دیا ہے، زمین کا ذرہ ذرہ معرفتِ الٰہی کا مظہر ہے، آسمان کا ذرہ ذرہ معرفتِ الٰہی کا مخزن ہے، سورج اللہ کی معرفت کا سامان، چاند اللہ کی معرفت کا سامان، شجر و حجر اللہ کی معرفت کا سامان، چیونٹی اللہ کی معرفت کا سامان، خود انسان اور اس کے اعضا اللہ کی معرفت کا سامان ہیں۔

بھائیو! اب بتاؤ کہ اللہ کی معرفت کتنی عام ہے؟ کھانا لینے تو آپ کو بازار جانا پڑے گا؛ لیکن معرفت حاصل کرنے کہیں جانے کی ضرورت نہیں، نیچے دیکھو تو معرفت اوپر دیکھو تو معرفت، داہنی طرف دیکھو تو معرفت، بائیں طرف دیکھو تو معرفت، سامنے دیکھو تو معرفت، پیچھے دیکھو تو معرفت، ہر سو اللہ کی معرفت کا سامان جمع ہے۔

اسی لئے ایک جگہ اللہ تعالی نے فرمایا: ﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْکِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ کُلِّ دَآبَّةٍ ص وَّ تَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ﴾ (البقرۃ: ۱۶۴)

(بلا شبہ زمین و آسمانوں کی تخلیق میں اور رات و دن کے آنے جانے میں اور کشتیوں میں، جو سمندر میں لوگوں کی نفع بخش چیزیں لے کر چلتی ہیں اور پانی میں، جس کو اللہ نے آسمان سے نازل کیا؛ پھر اس سے زمین کے خشک ہو جانے کے بعد اس کو تر و تازہ کیا (اور کھیتیاں اگائیں) اور ان سے زمین میں ہر قسم کے حیوانات پھیلائے اور ہواؤں کی سمتوں کے بدلنے میں (کہ کبھی پُروا ہوا چلتی ہے، تو کبھی

پچھوا، کبھی گرم، تو کبھی سرد) اور بادل میں، جو زمین و آسمان کے درمیان معلق ہے، ان سب میں عقل سے کام لینے والوں کے لیے نشانیاں موجود ہیں)

قرآن میں اس طرح کی سینکڑوں آیات ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو نفس و آفاق میں غور کر کے اللہ کی معرفت حاصل کرنے کی دعوت دی ہے۔

ایک جگہ کس قدر عجیب انداز سے فرمایا گیا: ﴿ اَفَلاَ یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ ﴾ (الغاشیة:۱۷-۲۰)

(تو کیا یہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنایا گیا ہے اور آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح بلند کیا گیا ہے اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح کھڑے کیے گئے ہیں اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح پھیلائی گئی ہے؟)

اس میں سبھی لوگوں کو بالعموم اور عربوں کو بالخصوص دعوت دی گئی ہے، جن کے پاس اونٹ ہوا کرتے تھے کہ اللہ کی قدرت دیکھنا ہو اور اس کی معرفت پیدا کرنا ہو، تو ان اونٹوں اور دیگر مخلوقات کو دیکھو اور معرفت حاصل کرو۔

حصولِ معرفت کا طریقہ

الغرض! اللہ کی صفات کو جاننے اور ان پر غور کرنے سے اللہ کی معرفت آتی ہے، اللہ کی بے شمار صفات ہیں، جیسا کہ اللہ کے صفاتی ناموں سے معلوم ہوتا ہے، اللہ کے ہزاروں صفاتی نام ہیں، ہر نام میں اللہ کی ایک صفت بیان کی گئی ہے، ان میں سے ایک مثال کے طور پر اللہ کا رحم و کرم ہے، یہ ایک ایسی صفت ہے کہ بچہ بچہ جانتا ہے، ہر آن اور ہر لمحہ اللہ کی طرف سے ہمارے اوپر رحم و کرم کی بارش ہو رہی ہے، یہ اتنی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس کھلی ہوئی حقیقت کو کھولنے کی کوشش کرنا تحصیلِ حاصل ہے۔

اب ہم نے اللہ تعالیٰ کو جانا کہ ہمارا رب وہ رب ہے، جو ہمارے اوپر ہر وقت احسان وکرم ورحم فرمارہا ہے، میں اٹھتا ہوں، تو اللہ کا رحم وکرم میرے ساتھ، بیٹھتا ہوں، تو اللہ کا رحم میرے ساتھ، میں کھاتا ہوں، تو اللہ کا رحم وکرم میرے ساتھ، ہر وقت اور ہر حال میں اللہ کا رحم وکرم میرے ساتھ، سب جگہ رحم ہی رحم اور کرم ہی کرم ہو رہا ہے۔

آپ بستر سے اٹھ رہے ہیں، اگر خدا کا رحم وکرم شاملِ حال نہ ہو، تو آپ بستر سے کیسے اٹھ جائیں گے؟ اگر خدا کا رحم وکرم نہ ہوا، تو آپ کا کھانا آپ کے حلق کے اندر کیسے اتر جائے گا، وہی لقمہ آپ کے لیے موت کی دعوت بن سکتا تھا؛ لیکن وہ لقمہ آپ کھاتے ہیں، اندر بھی پہنچتا ہے، ہضم ہوتا ہے، اس سے قوت بنتی ہے اور آپ کام کاج کرنے کے قابل ہوتے ہیں، دین ودنیا کے بہت سارے کام کاج کرنے لگتے ہیں، کیا یہ اللہ تعالیٰ کا رحم وکرم شامل حال ہونے ہی کی وجہ سے نہیں ہے؟

کھاتے وقت اللہ کا عجیب رحم وکرم

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے ایک جگہ پر فرمایا ہے کہ ہم جو روزانہ کھانا کھاتے ہیں، یہ اصل میں اگر ہم غور کریں، تو دو دفعہ اپنے اوپر فائرنگ کرنے کی طرح ہے، بندوق چلانے کی طرح ہے؛ کیوں؟ اس لیے کہ جب آپ لقمہ لیتے ہیں اور منھ میں رکھتے ہیں اور حلق میں اتارتے ہیں، تو حلق میں اتارنے کے وقت ایک ایسے کٹھن ونازک مرحلے سے آپ کو گذارا جاتا ہے کہ اگر آدمی تھوڑی دیر سوچے، تو پریشان ہو جائے، بڑا نازک مرحلہ ہوتا ہے!!

ہر انسان کے حلق میں دو نلکیاں ہوتی ہیں، ایک سامنے اور ایک پیچھے؛ پیچھے جو نلکی ہے، اس میں کھانا جاتا ہے اور سامنے جو نلکی ہے، اس میں ہوا کا آنا جانا

ہوتا ہے، جس سے آپ سانس لیتے ہیں، تو پہلے سانس کی نلکی آتی ہے اور سانس کی نلکی کو پار کر کے کھانا پیچھے کی نلکی میں جاتا ہے، اب سوچیے کہ اگر ذرا سا پانی کا قطرہ یا ذرا سا کھانے کا دانہ پیچھے کی نلکی میں جانے کے بجائے پہلی میں اُتر جائے، تو ہلاکت اور موت ہے؛ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کا کیا نظام بنایا؟ حلق کے پاس ایک چھوٹی سی جیب بنائی ہے اور جب انسان کھانا یا پینا چاہتا ہے، تو اس جیب کو حلق کے اوپر پُل کی طرح بنا دیتے ہیں، جب آپ کھانا کھاتے ہیں، تو وہ جیب پلٹ کر اس پہلی نلکی کو بند کر دیتی ہے اور اس پر پُل بن جاتی ہے اور کھانا اس پُل پر سے پار ہو کر اندر دوسری اندر والی نلکی میں چلا جاتا ہے۔

یہ ہے سسٹم، اب اس سسٹم پر تھوڑی دیر کے لیے غور کیجیے کہ وہ جیب بند نہ ہوئی تو کیا ہوگا، اگر کوئی پروبلم (problem) آ جائے؛ پھر تو ہلاکت ہی ہلاکت ہے۔

یہ رحم نہیں ہے اللہ کا؟ اگر خدا تعالیٰ کا رحم ایک منٹ کے لیے بھی؛ بل کہ ایک منٹ کے ۱۰۰ حصے میں سے بھی تھوڑے حصے میں نہ ہو، تو پھر انسان کے لیے ہلاکت ہے۔ اب روزانہ ہم تین دفعہ کھانا کھاتے ہیں، دراصل تین دفعہ ہم روزانہ اپنے اوپر فائرنگ کرتے ہیں۔ اب کھاتے وقت آدمی یہ سوچے کہ میں کھانے جا رہا ہوں اور اندر کی جیب کھل رہی ہے، پل بن رہا ہے، وہ میرا کیسا خدا اور مالک ہے، جس نے ایسا سسٹم بنا رکھا ہے۔ کیا اس سے اللہ کی معرفت پیدا نہیں ہوگی؟

صفتِ رحمت سے قرآن کی ابتدا

قرآنِ کریم جہاں شروع ہوا ہے، وہاں سب سے پہلے یہ آیت ہے۔ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ (شروع اللہ کے نام سے، جو بہت رحم والا نہایت مہربان ہے) رحیم ورحمان دو لفظ لائے گئے، دونوں مبالغے کے صیغے ہیں، دونوں

کے اندر انتہائی مبالغہ ہے، ”رحمٰن“ کے معنے ہیں،”بے انتہا رحم کرنے والا“ یہی معنیٰ رحیم کا بھی ہے اور دونوں میں فرق ہے، وہ فرق یہ ہے کہ رحمان اس کو کہتے ہیں، جس کا رحم وکرم ہر چیز پر عام ہو اور رحیم کہتے ہیں، اس کو جس کا فضل وکرم ورحم مخصوص قسم کے لوگوں کے لیے مخصوص انداز کا ہو، جیسے انبیا کے لیے مخصوص رحم ہے، اولیا کے لیے مخصوص کرم ہے، اپنے خاص بندوں کے لیے مخصوص انداز کا اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے، مخصوص رحم کرنے والے کو رحیم کہتے ہیں اور جس کی رحمت سب کے لیے عام ہو، چاہے کافر ہو، چاہے ماننے والا ہو، چاہے نہ ماننے والا ہو، چاہے وہ انسان ہو یا کوئی اور چیز ہو، سب کے لیے جس کی رحمت عام ہو، اسے ”رحمٰن“ کہتے ہیں۔

اسی لیے علمائے کرام نے لکھا ہے کہ کسی انسان کو ”رحمٰن“ نام رکھنا تو جائز نہیں ہے، ہاں! رحیم نام رکھ سکتے ہیں، اس لیے کہ انسان اس قدر عام رحم کا معاملہ کر ہی نہیں سکتا؛ لہٰذا انسان رحمان نہیں؛ بل کہ ”عبدالرحمان“ ہے، ”رحمان کا بندہ“ ہے؛ لیکن رحیم چاہے، تو رکھ سکتے ہیں، اس لیے کہ مخصوص رحم انسان بھی کسی کے ساتھ کر دیتا ہے؛ لیکن عام رحم جیسے اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، اچھوں پر، بُروں پر، انسانوں وجانوروں پر، ہر مخلوق پر، ہر طرح، ہر اعتبار سے، اس طرح رحم کرنے والا صرف اور صرف اللہ ہے۔

اللہ نے سب سے پہلے یہ آیت قرآن میں ذکر کی، یہ بتانے کے لیے کہ میری ذات کا عنوان ہی ”رحمٰن و رحیم“ ہے۔ جب ہم اللہ کی اس صفت میں غور کریں گے، تو معرفتِ الٰہی پیدا ہوگی۔

تصوف کا ایک مسئلہ

جب آپ کو یہ بات سمجھ میں آ گئی، تو اسی سے ایک تصوف کا مسئلہ بھی حل ہو گیا

وہ یہ کہ جہاں تک حصولِ معرفت کا مسئلہ ہے، اس کے لئے کسی شیخ و مرشد کی کوئی ضرورت نہیں، ہوسکتا ہے کچھ لوگوں کو یہ بات عجیب لگے؛ لیکن حقیقت یہی ہے؛ اس لیے کہ جیسا ابھی عرض کیا گیا، دنیا و مافیہا کا ہر ذرہ اپنے اندر معرفتِ الٰہی کا سامان رکھتا ہے، تو حصولِ معرفت کے لیے کسی شیخ کی ضرورت نہیں۔ اب سوال پیدا ہوگا کہ پھر پیر کی ضرورت کس لیے ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ معرفت کے آثار اپنے اندر پیدا کرنے کے لیے شیخ کی ضرورت ہے، حصولِ معرفت کے لیے نہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے معرفتِ الٰہی کے سلسلے میں کسی بھی انسان کو معذور قرار نہیں دیا ہے۔

مثلاً کوئی کہنے لگے، ''اے اللہ! مجھے تیری معرفت ملی ہی نہیں، معلوم ہی نہیں ہوا، میں کیا کروں''؟ اگر مجھے تیری معرفت مل جاتی، تو میں تیری عبادت کرتا، اگر اللہ کے سامنے یوں کہے گا، تو اس کا عذر معتبر نہیں ہوگا؛ اس لیے کہ کائنات کا ہر ذرہ معرفت کا سامان ہے۔ اسی لیے امام اعظم ابوحنیفہ رَحِمَهُ اللهُ کا مسلک یہ ہے: ''کسی بھی انسان کو اللہ کی معرفت اور توحید بتانے کے لیے کسی نبی کا آنا ضروری نہیں؛ بل کہ اس کے لیے اس کی عقل خود کافی ہے''۔ معلوم ہوا جب معرفتِ الٰہی کے لیے نبی ہی کی ضرورت نہیں، تو پھر شیخ کی کیا ضرورت ہے؟ ہاں! معرفت کے آثار اپنے اندر پیدا کرنے کے لیے شیخ کی ضرورت ہے۔

کیوں کہ معرفت کی شرعی تعریف صرف یہ نہیں ہے کہ اللہ کی صفات کو جان لیا جائے، کیوں کہ اتنا جاننا تو ہر مخلوق میں عام ہے، حتیٰ کہ کافر بھی اتنا جانتا ہے؛ بل کہ معرفت کی تعریف یہ ہے کہ اللہ کو اس طرح سے جانے پہچانے کہ اس کے آثار نمایاں ہوں اور ان سے انسان متأثر ہو۔

معرفت کا علم آثارِ معرفت ہی سے ہوتا ہے

جب اللہ کی معرفت بندے کے قلب میں آتی ہے، تو اس پر اس کے کچھ آثار مرتب ہوتے ہیں اور ہر چیز میں یہی بات ہے کہ جب کسی چیز کو جاننے کے بعد اُس کا اثر مرتب ہو، تب کہا جاتا ہے، سمجھا جاتا ہے، عوام میں بھی، خواص میں بھی کہ اس کو وہ چیز حاصل ہوگئی۔

مثال کے طور پر ایک لڑکا ہے، وہ اپنے باپ کو گالی دیتا ہے، تو آپ اُسے کہتے ہیں کہ کیا حرکت کر رہا ہے؟ وہ تو تیرا باپ ہے باپ!!۔ وہ لڑکا آپ کو پلٹ کر یہ کہے گا کہ مجھے آپ سے زیادہ معلوم ہے کہ یہ میرا باپ ہے۔ باپ ہونے کا علم بیٹے کو جتنا ہے، کسی اور کو کیا ہوسکتا ہے؟ ظاہر بات ہے، وہ دوسروں سے زیادہ اپنے باپ کی پہچان رکھتا ہے؛ لیکن اسے آپ بتاتے ہیں کہ بھائی! وہ تیرا باپ ہے باپ!!۔ کیوں بتاتے ہیں؟ اس لیے کہ باپ کو باپ جاننے کا جو اثر ہونا چاہیے، اس کا ادب، اس کی جلالت ،اس کی عظمت، اس کا خوف، اس کی خشیت، وہ اس کے اندر نہیں ہے؛ اس لیے آپ اسے کہتے ہیں، بھائی! یہ تیرا باپ ہے باپ!!۔ وہ اگر آپ کو پلٹ کر یہ جواب دے کہ مجھے تو آپ سے اچھا معلوم ہے کہ یہ میرا باپ ہے، تو آپ اسے کہتے ہیں کہ تو نے باپ کو جانا ہی نہیں ہے، اگر تو جان لیتا، تو پھر اس کی عظمت نہ ہونے کا کیا سوال؟ اس سے محبت نہ ہونے کا کیا سوال؟ اس کا ادب نہ کرنے کا کیا سوال؟ ظاہر بات ہے کہ یہ چیزیں جاننے کا اثر ہیں، لازمہ ہیں، وہ اس کے اندر آنا ضروری ہے۔

جب تک معرفت و پہچان کا اثر نہیں پیدا ہوگا، نہیں سمجھا جائے گا اور نہیں مانا جائے گا، نہیں قبول کیا جائے گا کہ اس کو اس چیز کی معرفت حاصل ہے، ہوسکتا ہے وہ لغت و ڈکشنری کے معنے کے لحاظ سے حاصل ہوگئی ہو؛ مگر شریعت میں اس کو

معرفت حاصل نہیں ہوئی۔

بالکل اسی طریقے پر بھائیو! اللہ کی معرفت؛ یعنی اللہ کے اوصاف اور کمالات اور اللہ کی خصوصیات کو جاننے و پہچاننے کا جو اثر ہونا چاہیے، جب تک وہ اثر ہمارے اندر نہیں پیدا ہوگا، یہی سمجھا جائے گا کہ اللہ کی معرفت نصیب نہیں ہے اور جب اس معرفت کے آثار پیدا ہو جائیں، تو سمجھا جائے گا کہ معرفت حاصل ہو گئی؛ اس لیے یوں کہا جا سکتا ہے ''معرفت کا علم آثارِ معرفت ہی سے ہوتا ہے''۔

اللہ کی معرفت کا پہلا اثر ''محبت'' ہے

اب آیئے یہ دیکھیں کہ معرفتِ الٰہی کے آثار کیا کیا ہیں؟ اللہ کی معرفت کا ایک اہم ترین اثر ''اللہ کی محبت ہے'' اور یہ قلب کی عبادت ہے، دل میں اللہ کی محبت آئے گی، تو دل اللہ کا عبادت گذار بنے گا اور جب دل کے اندر دنیا اور دنیا والوں کی محبت ہوگی، تو دل گنہ گار ہو جائے گا۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ (التوبة: ۲۴)

(اے نبی! آپ کہہ دیجیے کہ اگر تمھارے ماں باپ، تمہاری اولاد، تمہارے بھائی بہن، بیویاں، رشتہ دار، تمھارے مال، جو تم کماتے ہو، تجارت جس کے خسارے کا تم کو خطرہ لگا رہتا ہے، تمہارے مکانات، جن کو تم پسند کرتے ہو، یہ سب اگر تم کو اللہ و رسول اور اللہ کے راستے میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں، تو انتظار کرو

یہاں تک کہ اللہ کا حکم یعنی عذاب آجائے اور اللہ حد سے گزر جانے والوں کو ہدایت نہیں دیتے)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ ان لوگوں سے محبت نہ رکھو اور تم ماں باپ سے محبت نہیں کر سکتے، بیوی سے محبت نہیں کر سکتے، جائیداد واملاک سے محبت نہیں رکھ سکتے؛ بل کہ یہ فرمایا کہ ان سے اللہ ورسول سے زیادہ محبت نہیں رکھ سکتے۔ ہاں! والدین سے بھی محبت چاہیے، بیوی سے بھی محبت چاہیے، اگر والدین سے محبت نہ ہوگی، تو والدین کا حق کیسے ادا ہوگا، ان کا ادب کیسے کریں گے؟ سب سے محبت ہو؛ لیکن وہ محبت کمزور ہو اور اللہ ورسول کی محبت غالب ہو۔

معلوم یہ ہوا کہ ساری چیزوں کی محبت کمزور ہونی چاہیے، اللہ اور رسول کی محبت غالب ہونی چاہیے۔ یہ معرفت کا اثر ہے، جب بندہ اللہ کو پہچان لے گا اور یہ بھی پہچان لے گا کہ ماں باپ کو بنانے والا بھی وہی، میری بیوی کو بنانے والا بھی وہی، میرے بھائی بہنوں کو پیدا کرنے والا بھی وہی، جائیداد املاک کو پیدا کر کے مجھ تک پہنچا کر میرے لیے راحت کا سامان کرنے والا بھی وہی، تو اللہ کی محبت ضرور آئے گی؛ اس لیے جب معرفت آئے گی، تو اللہ کی محبت ضرور آئے گی۔

معرفت سے ہی محبت پیدا ہوتی ہے-امام رَبِیْعَۃُ الرَّائے کا واقعہ

یاد رکھیے کہ جب تک انسان کو اللہ کی پہچان نہ ہو، اس کے دل میں اللہ کی محبت پیدا نہیں ہوسکتی۔ بہت زمانہ پہلے یعنی بنو امیہ کے دور کا واقعہ ہے، جب کہ امام مالک رحمۃ اللہ ابھی طالبِ علمی کی زندگی گذار رہے تھے، ان کے ایک استاذ تھے، جن کا نام ''رَبِیْعَۃُ الرَّائے'' تھا، بہت بڑے عالم تھے، آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ امام مالک رحمۃ اللہ کے استاذ کیسے ہوں گے؟ بہت بڑے جلیل القدر فقیہ بھی تھے

اور محدث بھی تھے اور اللہ والے بزرگ بھی تھے، ان کے والد کا نام ''فروخ'' تھا۔

جب امام ربیعۃ الرائے ماں کے پیٹ میں تھے، تو ان کے والد'' فروخ'' خراسان کی جانب جہاد کی مُہم پر امیر المومنین کے حکم سے نکل گئے ؛ جب جہاد میں جانے کے لیے نکلے، تو چوں کہ ان کو معلوم نہیں تھا کہ کب واپسی ہوگی اور کیا حالات ہوں گے کہ زندہ بھی آؤں گا یا اللہ کی راہ میں شہید ہو جاؤں گا؛ اس لیے ان کے پاس جو ۳۰ رہزار دینار یا درہم تھے، انھوں نے اپنی بیوی کو دیا اور کہا کہ میں جہاد میں جا رہا ہوں اور یہ تیس ہزار تمھارے حوالے ہیں، ضرورت کے مطابق اس میں سے خرچ کرتے رہنا، اگر اللہ تعالیٰ نے زندگی باقی رکھی اور واپسی ہوگئی، تو پھر میں تم سے آ کر حساب لے لوں گا، یہ کہہ کر نکل گئے۔

جو نکلے، تو ایسے حالات ان کے اوپر آئے کہ'' تاریخِ بغداد'' (ایک کتاب کا نام) کے مطابق تقریباً اس واقعے کے ستائیس برس بعد ان کو لوٹنا نصیب ہوا، لمبے چوڑے عرصے کے بعد واپسی ہوئی۔ مدینہ ان کی بستی تھی اور اپنی بیوی کو مدینے میں ہی چھوڑ کر گئے تھے، جب واپس مدینہ آئے، تو دیکھا کہ وہاں کی پوری فضا بدلی ہوئی ہے، نئی نئی سڑکیں بن گئی ہیں، نئی نئی عمارتیں بن گئی ہیں، خیر! آئے اور بہت غور و فکر کے بعد اپنی گلی وغیرہ کو پہچانا اور اپنے گھر پہنچے اور جب پہنچے، تو وہ رات کا وقت تھا، اپنے گھوڑے کو ایک طرف باندھا اور نیزے سے دروازہ کھولا اور دروازے کے اندر گھسنے لگے، تو ایک صاحب باہر آ رہے تھے، دونوں میں ملاقات ہوئی، جب انھوں نے دیکھا کہ یہ اندر گھس رہے ہیں، تو ان کو ٹوکا اور کہا کہ ارے اللہ کے دشمن! کسی کے گھر میں بلا اجازت جانا جائز نہیں ہے، تو فروخ نے کہا: یہ کسی کا گھر نہیں ہے، یہ تو میرا گھر ہے، میرے گھر میں کس سے اجازت لوں؟ اب دونوں میں تو تو میں میں ہونے لگی، وہ کہتے ہیں یہ میرا گھر ہے اور وہ کہتے ہیں تم گھس نہیں سکتے، یہ

تو میرا گھر ہے، دونوں میں جو گفتگو ہوئی تو پڑوسی لوگ جمع ہوگئے، ربیعہ کہنے لگے کہ میں ان کو سلطان کے پاس فیصلے کے لیے لے جاؤں گا اور فروخ نے کہا کہ ہاں! میں بھی تم کو بادشاہ کے پاس لے جاؤں گا، یہ سب باتیں ہورہی تھیں کہ ان کی بیوی نے اندر سے سنا اور آکر دیکھا کہ کیا ہو رہا ہے؟

جو دیکھا تو تماشا یہ نظر آیا کہ دونوں باپ، بیٹے دست وگریبان ہیں، ان کو بڑا تعجب ہوا اور انھوں نے کہا کہ یہ معرفت نہ ہونے کی وجہ سے جھگڑا ہو رہا ہے، پہچان نہیں ہے، نہ باپ نے بیٹے کو پہچانا اور نہ بیٹے نے باپ کو پہچانا۔ بیوی نے کہا کہ تم دونوں آپس میں کیا کر رہے ہو؟ بیٹے سے کہا: بیٹا ربیعہ! یہ تو تمھارے باپ ہیں، ملاقات کرو اور ان سے کہا فروخ! یہ تمھارے بیٹے ہیں، ان سے ملاقات کرو۔ جب ماں نے پہچان کرائی، تو پھر دونوں نے معافی چاہی اور روتے ہوئے آپس میں گلے ملنے لگے۔ (تاریخِ بغداد: ۸/۴۲۲)

میں نے یہ مثال اس لیے دی تھی کہ جب دونوں میں پہچان نہیں تھی، تو لب ولہجے میں فرق اور انداز ایسا اور جب بیٹے کو معلوم ہوا کہ یہ میرے ابا جی ہیں اور باپ کو معلوم ہوا کہ یہ میرا بیٹا ہے، تو پھر گلے مل رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ معرفت و پہچان اتنی بڑی چیز ہے کہ جب پہچان ہوتی ہے، تو دل میں محبت آتی ہے اور پہچان نہیں ہوتی تو دل میں محبت نہیں ہوتی؛ اس لیے جب انسان اللہ کی پہچان اپنے اندر پیدا کرتا ہے، تو اس کے دل کے اندر اللہ کی محبت آجاتی ہے۔

معرفت کا ایک اثر ’’خوفِ الٰہی‘‘ ہے

معرفت کا ایک اثر خوفِ الٰہی ہے کہ آدمی اللہ کی جلالت وعظمت کی وجہ سے اللہ سے خوف کھائے اور ڈرے۔ ’’خوفِ خداوندی‘‘ معرفتِ الٰہی کے اثرات میں سے

بہت بڑا اثر ہے، جس میں اللہ کی معرفت ہوگی، وہ اللہ کا خوف اور خشیت بھی رکھے گا اور جس کے دل میں خوفِ الٰہی نہ ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دل میں معرفتِ الٰہی بھی نہیں ہے۔

اللہ کا خوف دو وجہ سے ہوتا ہے، ایک وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے میرے گناہوں کی وجہ سے عذاب دیں گے، اس وجہ سے اللہ سے ڈر رہا ہے، یہ تھرڈ کلاس ڈر ہے، اور فسٹ کلاس ڈر یہ ہے کہ اس لیے ڈر رہا ہے کہ اللہ کی عظمت وجلالت اس کے دل میں ہے کہ اللہ کیسی عظیم و بھاری ذات ہے، کتنی قدرت والی ذات ہے، اس اللہ کی عظمت و کبرائی کے پیشِ نظر وہ اللہ سے ڈرتا ہے۔

دونوں بھی درست ہیں ؛ لیکن ان میں اعلیٰ وادنی کا فرق ہے۔ اللہ کی عظمت وجلالت کے پیشِ نظر ہمارے دلوں میں خوفِ خدا پیدا ہوجائے اور یہ کب پیدا ہوگا؟ جب اللہ کی معرفت ہوگی۔ جیسے ایک شخص باپ کی عظمت کو جانتا ہے، تو اس کا خوف وڈر اس کے دل میں پیدا ہوجاتا ہے۔ باپ سے نہ ڈرنے والے دراصل باپ کی عظمت وجلالت سے واقف ہی نہیں ہوتے ؛ اس لیے وہ باپ کی توہین کرتے اور اس سے بے خوف ہوتے ہیں۔ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلالت کا مشاہدہ ہوجائے، تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ کا ڈر نہ پیدا ہو۔ جب یہ معلوم ہوا کہ اللہ کی ذات وہ ہے، جس کے بارے میں خود اس نے کہا ہے کہ : ﴿**يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ وَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ**﴾ (کہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو ارادہ کرتا ہے، اس کا فیصلہ کرتا ہے) اس کی عظیم ہستی کے سامنے کسی نبی یا ولی یا فرشتے کو لب کشائی کی مجال نہیں، اس کے سامنے کسی کی سفارش کرنا بھی اس کے اِذن وحکم کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ ان سب امور کی معرفت سے ضرور اللہ کا خوف پیدا ہوگا۔

خوفِ الٰہی بھی معرفت کا نتیجہ ہے۔ ایک واقعہ

اس سے معلوم ہوا کہ خوف بھی معرفت و پہچان کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے، اگر معرفت و پہچان نہ ہو، تو خوف نہیں آ سکتا، جب پہچان ہوگی، تو خوف آ جائے گا۔

امام جلال الدین رومی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے لکھا ہے کہ ایک آدمی سفر پر نکلا، جنگل میں چلتا رہا، جنگل میں بہت دور چلنے کے بعد اسے تھکان ہوئی اور تھکان کی وجہ سے نیند غالب ہوگئی، اس نے سوچا کہ کہیں آرام کرلوں؛ لیکن آرام کرنے اس لیے ہمت نہیں ہوئی کہ جنگل کا راستہ ہے اور جنگل کے راستے میں کیسے آرام کروں؟ سوچتا رہا کہ کوئی چیز مجھے ایسی مل جائے، جس کی وجہ سے مجھے کچھ سہارا مل جائے، تو میں آرام کرلوں، بہت آگے جانے کے بعد دیکھا کہ ایک جانور سویا ہوا ہے، اس نے کہا کہ بہت اچھا، یہ کوئی جانور سو رہا ہے، میں بھی اس کے بازو سو جاؤں۔

چناں چہ جانور کے بازو وہ بھی جا کر لیٹ گیا، نیند کا اتنا غلبہ تھا، تھکان ایسی تھی کہ بس پڑتے ہی نیند لگ گئی، کچھ دیر بعد اسی راستے سے ایک دو آدمی آ رہے تھے، پیچھے سے آتے آتے جب وہ وہاں پہنچے، تو ایک عجیب منظر انھوں نے دیکھا کہ ایک انسان سویا ہوا ہے اور اس کے بازو جو جانور سویا ہوا ہے، وہ حقیقت میں شیر ہے، یہ لوگ بہت پریشان ہوئے کہ کہیں یہ شیر جاگے اور اس بے چارے کو کھا جائے۔ انھوں نے آہستہ سے سونے والے کو آواز دی اور جگایا، جب وہ جاگا، تو ان لوگوں نے اس سے کہا کہ کہاں سوئے ہو؟ وہ تمھارے بازو شیر ہے شیر!!۔ بس جناب اتنا سنتے ہی وہ گھبرایا پریشان ہوا اور ڈر کے مارے اس کی جان نکل گئی اور مر گیا۔

دیکھیے! جب تک اسے شیر کی معرفت و پہچان نہیں تھی، تو اس پر شیر کا خوف بھی پیدا نہیں ہوا، جیسے ہی شیر کی معرفت حاصل ہوئی، تو اس کا خوف بھی پیدا ہوا اور وہ

مر گیا۔ اسی طرح جب اللہ کی پہچان انسان کو ہو جاتی ہے کہ اللہ کتنا بڑا اور زبردست ہے، کتنی بڑی طاقت والا ہے، وہ کیا سے کیا کر سکتا ہے، جب یہ پہچان اللہ کی انسان کو ہو گی، تو ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس کے دل کے اندر کوئی ہل چل نہ مچے اور اس کی وجہ سے اس کے دل میں اللہ کا خوف پیدا نہ ہو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خوف

دیکھیے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیاء اللہ کو معرفت حاصل تھی، تو وہ حضرات اللہ کا ڈر و خوف بھی رکھتے تھے۔ حدیث میں ہے، ایک صحابی کہتے ہیں کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا، تو دیکھا کہ " **وهو يصلي ولصدره أزيز كأزيز المرجل** " (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز پڑھ رہے تھے اور آپ کے سینے سے ایک آواز نکل رہی تھی جیسے ہانڈی پکنے کی آواز ہوتی ہے)(ابو داود: ۹۰۴، أحمد: ۱۶۳۵۵، شرح السنة: ۲۴۵/۳، نسائي: ۱۲۱۴)

حضرت عبید بن عمیر رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی عجیب بات سنائیے، جو آپ نے دیکھی ہو، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کچھ دیر خاموش رہیں، پھر کہا کہ ایک بار اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس رات میں لیٹے ہوئے تھے، آپ نے کہا کہ اے عائشہ! چھوڑ کہ میں آج رات اللہ کی عبادت کروں، حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں تو آپ کا قرب چاہتی ہوں اور یہ بھی کہ جو آپ کو پسند ہو۔ پھر آپ اٹھے اور وضو کیا اور نماز پڑھنے لگے اور برابر روتے رہے، یہاں تک کہ آپ کی ڈاڑھی مبارک اور زمین تر ہو گئی۔ پھر حضرت بلال آپ کو نماز فجر کے لیے بلانے آئے اور جب دیکھا کہ آپ رو رہے ہیں، تو عرض کیا کہ یا رسول اللہ!

آپ کیوں روتے ہیں؛ جب کہ اللہ نے آپ کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف کردیئے ہیں، تو فرمایا کہ کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟

(صحیح ابن حبان: ۲/۳۸۶، مشکل الآثار للطحاوي: ۱۰/۲۳۶، موارد الظمآن: ۱/۱۴۳)

صحابہ رضی اللہ عنہم کا خوف

اسی طرح حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی عارفین تھے، تو ان کو بھی خوفِ خدا حاصل تھا۔ بخاری وغیرہ میں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں آیا ہے کہ ایک بار اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا، حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کبھی ایسا خطبہ نہیں سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں فرمایا: "**لو تعلمون ما أعلم لضحكتم قليلا و لبكيتم كثيرا**" (اگر تم ان باتوں کو جان لو، جو میں جانتا ہوں، تو تم بہت کم ہنستے اور زیادہ روتے) یہ سن کر حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم سب کے سب رونے لگے۔ ایک روایت میں ہے کہ صحابہ نے اپنے سروں کو ڈھانپ لیا اور رونے لگے۔ **(بخاري: ۴۶۲۱)**

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے "**سورة المطففين**" نماز میں پڑھی اور آیت: "**يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ**" (جس دن کہ لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے) تک پہنچے، تو روتے رہے یہاں تک کہ بے ہوش کر گر پڑے۔ **(صفة الصفوة: ۱/۲۰۳)**

اولیاء اللہ کا خوف

حضراتِ اولیا اللہ کا خوف بھی دیکھیے! ایک بڑے بزرگ حضرت منصور بن عمار رحمہ اللہ گزرے ہیں، امام ابن الجوزی رحمہ اللہ نے ان سے ایک اللہ

والے کا قصہ ذکر کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں رات میں باہر نکلا، ابھی رات کا ایک حصہ باقی تھا، میں کسی کے ایک چھوٹے سے دروازے کے پاس بیٹھ گیا، تو وہاں ایک نوجوان کی آواز آرہی تھی، جو رورہا تھا اور اللہ سے یوں کہتا جارہا تھا ''اے اللہ! تیری عزت وجلالت کی قسم، میں گناہ کر کے تیری مخالفت کرنا نہیں چاہا اور جب میں نے تیری نافرمانی کی ہے، تو میں تیری سزا سے لاعلم نہیں تھا اور نہ تیری نظر سے غائب تھا؛ لیکن میرے نفس نے مجھے چکما و دھوکہ دیا اور مجھ پر بدبختی غالب آگئی اور میرے گناہوں پر پڑے ہوئے تیرے پردے نے مجھے مغرور کردیا اور اب مجھے تیرے عذاب سے کون بچائے گا اور اگر تیری رسی سے میں کٹ جاؤں گا، تو کس کی رسی کو تھاموں گا، ہائے!! میں کتنی دفعہ توبہ کروں اور کتنی دفعہ پھر گناہوں کی طرف جاؤں؟ اب وقت آگیا کہ میں میرے رب سے شرماؤں''۔ حضرت منصور بن عمار رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ سن کر زور سے یہ آیت پڑھ دی: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴾ (التحریم: ٦)

(اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ، جس کا ایندھن انسان و پتھر ہیں، جس پر سخت گیر وتندخو فرشتے مقرر ہیں)

کہتے ہیں کہ پھر میں نے ایک اضطراب و پریشانی کی آواز محسوس کی اور اپنے کام سے چلا گیا، صبح کو جب واپس ہوا، تو دیکھا کہ اسی گھر پر ایک جنازہ رکھا ہوا ہے اور ایک بوڑھی عورت وہاں آ، جارہی ہے، میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کس کا جنازہ ہے؟ تو کہنے لگی کہ میرے غم کو تازہ مت کرو، میں نے کہا کہ میں مسافر ہوں، اس

لیے پوچھ رہا ہوں، تو کہنے لگی کہ یہ میرا بیٹا ہے، رات کسی نے ایک آیت پڑھ دی تھی، جس میں جہنم کا ذکر تھا، اس کو سن کر میرا بیٹا بے قرار ہو گیا اور روتا رہا، یہاں تک کہ مر گیا۔ حضرت منصور رَحِمَہُ اللہُ کہتے ہیں کہ یہی ان حضرات کی صفت ہوتی ہے، جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔ (التبصرہ: علامہ ابن الجوازی: ۱۷)

تو دیکھیے! یہ مثالیں میں نے دی کہ معرفت سے محبت بھی پیدا ہوتی ہے اور خوف بھی، دونوں جگہ جو مشترک مضمون ہے، وہ کیا ہے؟ ''پہچان''، پہچان ہوئی تو محبت آئی، پہچان ہوئی تو خوف آیا، پہچان نہیں تو محبت بھی نہیں، خوف بھی نہیں، اسی لیے عام طور پر اللہ کی محبت اور اللہ کا خوف نہیں ہوتا، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ صحیح معنوں میں اللہ کی پہچان نہیں؛ صحیح معنوں میں اللہ کی پہچان ہو، تو ضرور ان شا اللہ یہ دونوں چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔

معرفت کا ایک اثر ''عبدیت و بندگی'' ہے

جب اللہ کی معرفت بندے کو نصیب ہوتی ہے، تو بندے پر معرفت کا ایک اثر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عبدیت و عجز کا حامل ہو جاتا ہے اور اسی سے پھر اللہ تعالیٰ کی عبادت کثرت سے کرتا ہے، اس عبدیت و عبادت کے اثر سے پہچانا جائے گا کہ معرفت حاصل ہے یا نہیں؛ اس لیے کہ ہمارے اور آپ کے لیے نمونہ اور اسوہ ''آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم'' کی ذاتِ اقدس ہے، آپ اللہ تعالیٰ کے سب سے بڑے عارف تھے اور سب سے زیادہ عبدیت بھی آپ میں تھی اور عبادت بھی آپ سب سے زیادہ کرنے والے تھے۔ اتنی عبادت کرتے تھے کہ پاؤں میں ورم آجاتا تھا، صحابہ کو ترس آجاتا تھا، پوچھتے یا رسول اللہ! آپ تو بخشے بخشائے ہیں، اس قدر عبادت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ عَلَیْہِ السَّلَام فرماتے: ''أفلا أكون عبدا

شکوراً؟" (کیا میں اللہ کا شکر گذار بندہ نہ بنوں)

(بخاری: ۱/۱۵۲، مسلم: ۲/۳۷۷)

اسی طرح تمام صحابہ اور اولیا اللہ نے بھی اللہ کو پہچانا، جس کا اثر ان پر یہ ہوا کہ وہ کثرت سے عبادت انجام دیتے تھے۔ معلوم ہوا کہ معرفت کا ایک اثر عبادت ہے؛ لہٰذا جو بغیر عبادت کیے معرفت کا دعویٰ کرے، وہ جھوٹا ہے۔

عبادت کیا ہے؟

عبادت کیا ہے؟ عبادت کسے کہتے ہیں؟ اللہ کا جو بھی حکم بندے کو جہاں بھی آئے، جس وقت بھی آئے اسے انجام دینا عبادت ہے، عبادت دراصل انتہائی خضوع اور انتہائی ذِلت کے اختیار کرنے کا نام ہے، اللہ کی بڑائی، اللہ کی جلالت، اللہ کی عظمت کے سامنے بندہ اپنے آپ کو ذلیل کردے، تو اس کا نام عبادت ہے۔ پھر عبادت دو قسم کی ہوتی ہے: ایک قلبی عبادت اور ایک جسمانی عبادت، جسم سے بھی عبادت ہوتی ہے اور قلب سے بھی عبادت ہوتی ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھیے، ہم نماز پڑھتے ہیں، جسم حرکت میں آتا ہے کہ آدمی ہاتھ اٹھاتا ہے، اللہ کے سامنے عاجزانہ باندھ لیتا ہے اور پھر اللہ کی ستائش کرنے لگتا ہے؛ پھر اس کے سامنے جھک جاتا ہے، جسے رکوع کہتے ہیں؛ پھر مزید اور جھکتے ہوئے اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ یہ جو عبادت ہو رہی ہے، جسم کی عبادت ہے اور پھر ایک عبادت اسی عبادت کے اندر ہے، وہ ہے خشوع اور خضوع اور اخلاص، اب یہ جو اندرونی عبادت ہوتی ہے، وہ بھی دراصل اسی کا جزو ہے اور وہ قلبی عبادت ہے اور یہ دونوں ضروری ہیں۔

اگر ایک آدمی صرف اٹھ رہا ہو، رکوع وسجدے میں جھک رہا ہو؛ لیکن قلب کے

اندر وہ خشوع نہ ہو، خضوع نہ ہو، اللہ سے محبت نہ ہو، تعلق نہ ہو، تو وہ عبادت نہیں؛ بل کہ صرف اٹھنا اور بیٹھنا ہے۔ جیسے بہت سارے لوگ نماز پڑھتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے پہلوانی کر رہے ہیں، کسرت کر رہے ہیں، اٹھ رہے ہیں، بیٹھ رہے ہیں، جھپٹ رہے ہیں اور تیز تیز رکوع وسجدہ ہو رہا ہے اور آزو بازو کے لوگوں کو ذرا اپنی قوت دکھاتے ہوئے مار بھی رہے ہیں۔ یہ کوئی عبادت ہے؟ عبادت تو عاجزی کا نام ہے، عبادت وہ ہے، جس کے اندر انتہائی ذلت اور مَسکنت بھری ہوئی ہو۔

ڈِینگ مارنے والے معرفت سے خالی

اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اللہ والے کبھی اپنی بڑائی نہیں کرتے، وہ ڈینگیں نہیں مارتے؛ بل کہ وہ تو عاجزی وانکساری والے ہوتے ہیں۔ کسی شاعر نے بہت اچھی بات کہی ہے کہ:

تکمیلِ بشر نہیں ہے سلطاں ہونا
یا صف میں فرشتوں کے نمایاں ہونا
تکمیلِ بشر ہے، عجز و بندگی کا احساس
انسان کی معراج ہے انساں ہونا

آج ایک طبقہ ولایت کا مدعی ایسا پیدا ہو گیا ہے کہ صرف ڈینگیں مارنا اس کا کام ہے، کبھی ولایت کا دعویٰ، کبھی کرامت کا دعویٰ، کبھی بزرگی کا دعویٰ، یہ سب باتیں اولیا اللہ کی صفات سے دور ہیں؛ وہ عجز و بندگی کو ہی اپنا سرمایۂ افتخار سمجھتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی انکساری کا حال

اب ذرا یہ بھی دیکھیے کہ ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عاجزی و

انکساری کا کیا حال تھا؟ ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص کو لایا گیا اور اس پر اس وقت آپ کے رعب کی وجہ سے کپکپی طاری ہوگئی، آپ نے اس کو دیکھا، تو ایک عجیب انکساری و تواضع کا جملہ فرمایا، وہ یہ کہ "أنا ابن امرأة من قريش كانت تأكل القديد في هٰذه البطحاء" (میں تو قریش کی ایک عورت کا لڑکا ہوں، جو سوکھا ہوا گوشت کھایا کرتی تھی) اور ایک روایت میں یوں ہے کہ اپنے اوپر آسانی کر، میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں، ایک عورت کا بیٹا ہوں، جو سوکھا ہوا گوشت کھایا کرتی تھی۔ (مستدرک: ۴/۱۵۸، ابن ماجہ: ۳۳۱۲)

اللہ اکبر! کیا ٹھکانہ ہے اس عاجزی و انکساری کا! اور یہ درحقیقت اللہ جل شانہ کی عظمت وجلالت کی معرفت کا نتیجہ ہوتا ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بارگاہِ الٰہی میں عجز و نیاز

اس عاجزی و انکساری پر آپ علیہ السلام کی ایک دعا کی طرف ذہن منتقل ہو گیا، جس میں آپ نے اللہ تعالیٰ کے سامنے انتہائی و غایت درجے کی تواضع و انکساری کا مظاہرہ کیا ہے، وہ دعا یہ ہے: " اَللّٰهُمَّ إِنَّکَ تَسْمَعُ کَلَامِيْ وَ تَرىٰ مَکَانِيْ وَ تَعْلَمُ سِرِّيْ وَ عَلَانِيَتِيْ وَلَا يَخْفىٰ عَلَيْکَ شَيْءٌ مِنْ أَمْرِيْ ؛ وَ أَنَا الْبَائِسُ الْفَقِيْرُ، الْمُسْتَغِيْثُ، الْمُسْتَجِيْرُ، الْوَجِلُ، الْمُشْفِقُ، الْمُقِرُّ الْمُعْتَرِفُ بِذَنْبِيْ، أَسْئَلُکَ مَسْئَلَةَ الْمِسْکِيْنِ وَ أَبْتَهِلُ إِلَيْکَ اِبْتِهَالَ الْمُذْنِبِ الذَّلِيْلِ وَ أَدْعُوْکَ دُعَاءَ الْخَائِفِ الضَّرِيْرِ؛ مَنْ خَضَعَتْ لَکَ رَقَبَتُهٗ وَفَاضَتْ لَکَ عَيْنَاهُ وَ ذَلَّ جَسَدُهٗ وَ رَغِمَ أَنْفُهٗ لَکَ، اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْنِيْ بِدُعَائِکَ شَقِيًّا وَّ کُنْ بِيْ رَءُ وْفًا رَّحِيْمًا يَا خَيْرَ الْمَسْئُوْلِيْنَ! وَ يَا خَيْرَ الْمُعْطِيْنَ! " (اے اللہ! بلا شبہ تو میری بات سنتا ہے اور میری جگہ کو دیکھتا

ہے اور میری پوشیدہ و ظاہر ہر قسم کی بات کو جانتا ہے، اور تجھ پر میری کوئی بات مخفی نہیں، اور میں مصیبت زدہ ہوں، فقیر ہوں، فریادی ہوں، پناہ جو ہوں، ترساں و ہراساں ہوں، اپنے گناہوں کا معترف و اقراری مجرم ہوں، میں تجھ سے مسکین کی طرح سوال کرتا ہوں اور تیرے سامنے ذلیل گناہ گار کی طرح گڑگڑاتا ہوں اور تجھ سے خوف زدہ، آفت رسیدہ کی طرح مانگتا ہوں، جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہوئی ہو اور جس کے آنسو بہہ رہے ہوں اور جس کا جسم تیرے سامنے عاجز ہو اور جو تیرے سامنے اپنی ناک رگڑتا ہو؛ اے اللہ! تو مجھے دعا میں ناکام نہ فرما اور مجھ پر تو رحیم و کریم ہو جا، اے سوال کیے جانے والوں میں سب سے بہتر! اور اے عطا کرنے والوں میں سب سے بہتر!)

(المعجم الکبیر طبرانی: ۱۱/ ۱۷۴، المعجم الصغیر: ۲/ ۱۵)

اس دعا کا ایک ایک لفظ جس فروتنی و عاجزی و مسکنت و تواضع و انکساری کا حامل ہے، وہ بہت ہی واضح و ظاہر ہے۔ الغرض! یہ عجز و انکساری بھی معرفتِ خداوندی کا ایک اثر ہے۔

اللہ کی معرفت کا ایک اثر ’’توکل علی اللہ‘‘ ہے

جب بندے کو اللہ کی پہچان ہوتی ہے، تو پہچان کے نتیجے میں وہ اللہ پر اعتماد ضرور کرے گا، اللہ پر بھروسہ ضرور کرے گا، جن لوگوں کو اللہ پر بھروسہ نہیں ہے، مطلب یہ ہے کہ ان کو خدا کی پہچان نہیں ہے۔ کیسے؟ اس لیے کہ جب وہ اللہ کو پہچانے گا، تو اللہ کی صفات کی حقیقت سامنے آئے گی کہ میرا اللہ وہ اللہ ہے، جو میرے لیے ہر چیز میں بھلائی چاہتا ہے، میرے لیے کوئی مصیبت نہیں چاہتا، میرے لیے کوئی پریشانی نہیں چاہتا، میرے لیے اچھائی اور بھلائی ہی چاہتا ہے، برائی نہیں

چاہتا، جو کچھ بھی وہ کرتا ہے ہماری بھلائی کے لیے کرتا ہے؛ تو جب وہ کھلے طور پر یہ دیکھتا ہے، تو اس کا دل کہتا ہے کہ اس کے اوپر مجھے کلی اعتماد کرنا ہے کہ جو کرتا ہے صحیح کرتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایمان افروز واقعہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک ایمان افروز ارشاد و واقعہ ملاحظہ کیجیے! وہ یہ کہ مسافر بن عوف بن الاحمر نے ایک بار (جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اہلِ نہروان سے جہاد کے لیے نکلنا چاہتے تھے) کہا کہ آپ اس وقت نہ جائیں اور دن کے تین گھنٹے گزرنے کے بعد جائیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کیوں؟ اس نے کہا کیوں کہ آپ اِس گھڑی میں جائیں گے، تو آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو بلا و شدید نقصان پہنچے گا اور اگر اُس وقت میں جائیں، جو میں نے بتایا ہے، تو آپ کو کام یابی و غلبہ نصیب ہوگا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی نجومی نہیں تھا اور نہ اب تک ہمارا کوئی نجومی ہے، کیا تو جانتا ہے کہ اس تیرے گھوڑے کے پیٹ میں کیا ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں! اگر میں حساب لگاؤں، تو جان لوں گا، آپ نے کہا کہ جس نے تیری اس بات کی تصدیق کی اس نے قرآن کی تکذیب کی؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ تو یہ کہتے ہیں کہ ﴿إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ج وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ج وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ﴾ (اللہ ہی پاس قیامت کا علم ہے، وہی بارش نازل کرتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ ماں کے رحم میں کیا ہے) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس چیز کے جاننے کا دعویٰ نہیں کیا، جس کا تو نے دعویٰ کیا ہے، کیا تو گمان کرتا ہے، تو اس گھڑی و وقت کو جانتا ہے، جس میں سفر کرنے سے کوئی برائی لاحق ہوگی؟ اس نے کہا کہ ہاں! آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس نے تیری اس بات کی تصدیق کی وہ گویا برائی

کے پہنچانے کے بارے میں اللہ سے مستغنی ہوگیا اور اس کو مناسب ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر تجھے ہی اپنے معاملہ کا متولی بنا دے؛ کیوں کہ تو گمان کرتا ہے کہ تو اس کو اس گھڑی کی جانب ہدایت کرسکتا ہے، جس میں سفر کرنے سے وہ برائی سے نجات پا جائے گا؛ پس جس نے اس بات کو سچ سمجھا مجھے اس پر اندیشہ ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ شرک کرنے والے کی طرح ہے۔

پھر آپ نے فرمایا: ''اے اللہ! کوئی فال نہیں ہے؛ مگر تیرا فال اور کوئی خیر نہیں ہے؛ مگر تیرا خیر''۔ پھر اس شخص سے فرمایا کہ ہم تیری تکذیب ومخالفت کرتے ہیں اور اسی گھڑی میں سفر کرتے ہیں، جس سے تو نے روکا ہے، پھر آپ نے لوگوں کو دیکھ کر فرمایا کہ اے لوگو! تم علمِ نجوم سے بچو! مگر وہ جس سے خشکی وسمندر کی اندھیریوں میں راستہ پا سکو، نجومی تو کافر ہے اور کافر جہنمی ہے۔ پھر اس شخص سے کہا: ''اللہ کی قسم! اگر مجھے یہ بات پہنچی کہ تو علمِ نجوم میں غور وفکر کرتا اور اس پر عمل کرتا ہے، تو میں تجھے تیرے یا میرے رہنے تک حبسِ دوام میں رکھ دوں گا اور جتنا میرے بس میں ہے، اس قدر تجھ کو بخشش سے محروم کردوں گا''۔

اس کے بعد آپ اسی وقت میں سفر پر نکلے، جس میں نکلنے سے اس نے منع کیا تھا اور اہلِ نہروان کے پاس آئے اور ان کو قتل کیا، پھر فرمایا کہ اگر ہم اُس وقت میں چلتے، جس میں چلنے کا اس شخص نے حکم دیا تھا اور فتح وغلبہ پاتے، تو کوئی کہنے والا یہ کہتا کہ یہ اسی وقت میں چلے تھے، جس میں چلنے کا نجومی نے حکم دیا تھا۔ حضرت محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا کوئی نجومی نہیں تھا اور نہ اب تک ہمارا کوئی نجومی ہے، مگر اللہ نے ہمارے لیے کسریٰ اور قیصر کے شہروں اور دیگر ممالک کو فتح کرا دیا، پس تم اللہ پر توکل کرو اور اسی پر اعتماد کرو کہ وہی اپنے ماسوا سے ہمارے لیے کافی ہے۔

(مسند الحارث: ۲/ ۶۰۱، کنز العمال: ۵/ ۲۳۵)

یہ ہے توکل علی اللہ، جو انسان کو معرفتِ خداوندی کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے، جس سے انسان یہ سمجھتا ہے کہ میرا پروردگار میرا کارسازِ حقیقی ہے، مجھے کسی فکر کی ضرورت نہیں۔

ایک شعر اور حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ کی اس میں اصلاح

یہاں مجھے ایک شاعر کا شعر یاد آ گیا، وہ کہتا ہے کہ

کارسازِ ما بفکرِ کارِ ما ☆ فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

(ہمارا کارسازِ حقیقی ہمارے کاموں کی فکر میں لگا ہوا ہے؛ لہٰذا ہمارے کاموں میں ہمارا فکر کرنا، خود کو تکلیف پہنچانا ہے)

اس شعر میں شاعر نے اللہ کے لیے فکر کا لفظ استعمال کیا ہے؛ حالاں کہ اللہ کو کسی فکر کی ضرورت نہیں؛ اس لیے حضرت حکیم الامت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے فرمایا کہ یہ شاعر جاہل ہے عارف نہیں؛ اس لیے اسے یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اللہ کے لیے کیا لفظ استعمال کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے؟ کیا اللہ تعالیٰ کو کسی کے کام بنانے کے لیے فکر کی ضرورت پڑتی ہے؟ نہیں! لہٰذا حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے فرمایا کہ میں اس شعر میں ذرا ترمیم کرتا ہوں، وہ ترمیم یہ ہے کہ

کارسازِ ما بسازِ کارِ ما ☆ فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

اب کیا مطلب ہوا؟ یہ مطلب ہوا کہ ہمارا کارسازِ حقیقی ہمارے کاموں کے بنانے میں لگا ہوا ہے؛ لہٰذا ہمارا خود کے کاموں کی فکر میں لگنا خود کو تکلیف دینا ہے۔

دیکھیے کہ حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے کس طرح ذرا سی تبدیلی سے اس شعر کو صحیح کر دیا اور اس کے مضمون کو اسلامی عقیدے سے ہم آہنگ کر دیا۔

الغرض! معرفت کا یہ اثر ہے کہ اللہ پر اعتماد و توکل پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ جو بھی

فیصلہ کرے، جوبھی کام کرے، سب عین حکمت ومصلحت ہے۔

اللہ ہر کام وقت پر کرتا ہے -ایک بزرگ کا واقعہ

ایک قصہ یاد آ گیا کہ ایک بزرگ جارہے تھے، بہت سخت گرمی پڑ رہی تھی، یہ بڑی پریشانی کے ساتھ چل رہے تھے،اچانک بارش ہونے لگی، ٹھنڈے ٹھنڈے بارش کے قطرات جب ان کے جسم پر پڑے،توان کی زبان پر بے ساختہ و بے اختیار ایک جملہ آ گیا،انھوں نے کہا: ''واہ! آج کیا وقت پر بارش ہوئی''!اس پر فوراً اللہ کی طرف سے الہام ہوا اور عتاب نازل ہوا کہ او بے ادب! کیا ہم نے کبھی بے وقت بھی بارش برسائی ہے؟ ہم جوبھی کرتے ہیں وقت پر ہی تو کرتے ہیں، تجھے پیدا کیا تو وقت پر کیا، تجھے بخار دی تو وقت پر دیا، تجھے صحت دی تو وقت پر دیا، تجھے ماریں گے، تو وقت پر ماریں گے۔کیا مطلب ہوا؟ کہ اللہ تعالیٰ پر جب اعتماد ہو کہ وہ سب کام حکمت و مصلحت کے مطابق کرتے ہیں،تو اللہ پر توکل واعتماد کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔

معرفت کا ایک اثر ''رضا بالقضا''

اسی توکل واعتماد سے ایک اور اثر معرفت کا یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عارف باللہ، اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے پر راضی رہتا ہے، اس کو اسلام میں ''رضا بالقضا'' کہتے ہیں۔ یہ بھی ایک اہم اثر وعلامت ہے معرفتِ الٰہیہ کا، اس کے بغیر تو ایمان بھی مکمل نہیں ہوتا؛ لہٰذا ضروری ہے کہ اللہ کے ہر فیصلے پر مومن راضی رہے اور راضی رہنے کا مطلب یہ ہے کہ دل اللہ کے ہر فیصلے پر مطمئن رہے کہ جوبھی اُس نے کیا صحیح ودرست کیا اور ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعاؤں میں بھی اللہ سے اس کا سوال کیا ہے۔آپ ﷺ نے ایک دعا میں فرمایا کہ '' أللّٰهُم إني

أسئلک الرَّضا بالقضاء"(اے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں رضا بالقضا)

(سنن النسائی: ۱۳۰۶،السنن الکبری نسائی:۴۰۳، کنز العمال: ۳۶۱۱)

اس سے معلوم ہوا کہ جولوگ اللہ پر اس کے فیصلوں میں اعتراض کرتے ہیں، وہ درحقیقت معرفتِ الٰہیہ سے دور ہیں، اگر اللہ کی معرفت ان کو نصیب ہوتی اور وہ اللہ کی اس صفت سے واقف ہوتے کہ وہ حکیم ہے، تو اعتراض کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اللہ بہترین مربی ہیں

قرآن میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیتِ کاملہ کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔قرآن پاک کے شروع ہی میں ربوبیت کا ذکر ہے:﴿ **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ**﴾ (تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں، جو تمام عالموں کا پروردگار ہے،رب ہے) رب کے کیا معنے آتے ہیں؟"تربیت کرنے والا"، ماں تربیت کرتی ہے، باپ تربیت کرتا ہے، استاذ اور پیرو شیخ بھی تربیت کرتا ہے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی تربیت بھی مجازی ہے اور ان کو مربی کہنا بھی مجازی اعتبار سے ہے، ورنہ حقیقی مربی تو اللہ جل جلالہ ہیں، جو ساری کائنات کے ذرے ذرے کی تربیت کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ انسانوں کو کبھی مختلف قسم کی نعمتیں دے کر اور کبھی ان نعمتوں کو چھین کر اور کبھی بیماری دے کر اور کبھی اس کی جگہ شفا دے کر ان کی تربیت کرتا ہے۔ حوادثات، پریشانیاں، مصائب اور مختلف قسم کے جھنجھوڑ کر رکھ دینے والے حالات و واقعات، یہ سب کچھ پیش آتے رہتے ہیں، یہ ساری کی ساری چیزیں دراصل اللہ کی ربوبیت وتربیت کے نتیجے میں پیش آتی رہتی ہیں۔

بعض وقت بعض بیماریاں آجاتی ہیں، تو ڈاکٹر کہتے ہیں کہ مریض کو کھانا بالکل نہ دیا جائے، تو کیا آپ یہ حکم لگا دیں گے کہ ڈاکٹر صاحب بڑے ظالم ہیں؟ ڈاکٹر کو

ظالم کہتے ہیں یا رحیم کہتے ہیں؟ بل کہ سب رحیم ہی کہتے ہیں ۔ بھائیو! کیوں؟ اس لیے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بات جو ڈاکٹر صاحب نے کہی، یہ ان کے علمِ طب کا تقاضا ہے، اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کبھی ہمارا کھانا بند کر دیتا ہے، فقر و فاقے میں مبتلا کر دیتا ہے، کبھی کسی اور بیماری و پریشانی میں مبتلا کر دیتا ہے، تو ہم اللہ کو کیوں رحیم نہ کہیں!!

ہم نہیں جانتے کہ ہمارے لیے کس میں بھلائی ہے؛ مگر اللہ جانتے ہیں کہ ہمارے لیے کیا مفید ہے، کیا غیر مفید ہے، اللہ ہی مصلحتوں کو جاننے والے ہیں، وہ حکیم ہیں، ان کا ہر کام کسی حکمت پر مبنی ہوتا ہے، کبھی وہ ہمیں دنیوی پریشانی دے کر ہماری آخرت بنانا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”ما يصيبُ المسلمَ من نصب ولا وصب ولا هم ولا حزن ولا أذى ولا غم حتى الشوكة يشاكها إلا كفر الله بها من خطاياه“ (مسلمان کو کوئی کانٹا لگے، بیماری ہو جائے یا کوئی پریشانی پہنچے یا کوئی غم یا کوئی تکلیف واذیت حتیٰ کہ کوئی کانٹا چبھے، تو اللہ اس سے اس کی خطاؤں کا کفارہ کر دیتے ہیں)

(صحیح بخاری: ۵۳۱۸، صحیح ابن حبان: ۲۹۰۵، الادب المفرد: حدیث: ۴۹۲)

اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اس سے ایک نیکی بھی لکھی جاتی ہے۔

(مسلم: ۶۷۳۲، مسند احمد: ۱۲۶۰۹)

یعنی تمھیں ایک کانٹا چبھتا ہے، تو تمھارا ایک گناہ مٹایا جاتا ہے اور ایک نیکی لکھی جاتی ہے، ٹھوکر لگتی ہے، ایک گناہ مٹایا جاتا ہے اور ایک نیکی لکھی جاتی ہے ۔ غرض! جو بھی تکلیف دہ بات پیش آئے، اس پر ایک نیکی لکھی جاتی ہے اور ایک ایک گناہ مٹایا جاتا ہے۔

ایک دوسری حدیث پاک میں آتا ہے، اللہ کے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک رات کا بخار ایک سال کے گناہوں کو دھو دیتا ہے۔

(مسند قضاعی: ۶۱)

غور کریں کہ جسے ہم تکلیف سمجھتے ہیں، اس میں دراصل ہماری آخرت بن رہی ہے، کتنی بڑی نعمت ہے؟ اس لیے ہمیں چاہیے کہ اللہ کے ہر فیصلے پر راضی رہیں، اسی کا نام ''رضا بالقضا'' ہے، جو بہت بڑی دولت ہے، جس پر حدیث میں بڑی فضیلت بھی آئی ہے؛ چناں چہ اللہ کے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: **ذَاقَ طعْمَ الإِيْمان مَنْ رَضِيَ بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِيْنًا وَبِمُحَمَّدٍ نَبِياً وَرَسُوْلاً** ''(وہ آدمی ایمان کا مزا چکھ لیا، جو اللہ سے رب ہونے کی حیثیت سے راضی ہو گیا اور اسلام سے دین ہونے کی حیثیت سے راضی ہو گیا اور محمد ﷺ سے نبی اور رسول ہونے کی حیثیت سے راضی ہو گیا) (مسلم: ۱/۴۷)

معلوم ہوا کہ معرفت کا ایک اثر ''رضا بالقضا'' بھی ہے۔ یہ سارے آثار جس بندے پر ظاہر ہوں، سمجھا جائے گا کہ اس کو اللہ کی معرفت حاصل ہے۔

اب دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم تمام لوگوں کو اپنی معرفت کا ایک حصہ عطا فرمائیں اور اس کے ذریعے ''محبتِ الٰہی'' اور ''خوفِ الٰہی'' وغیرہ آثارِ معرفت کی دولت سے بھی مالا مال فرمائیں۔

آمین یا رب العالمین۔

شیطانی
حربے

بسم اللہ الرحمن الرحیم
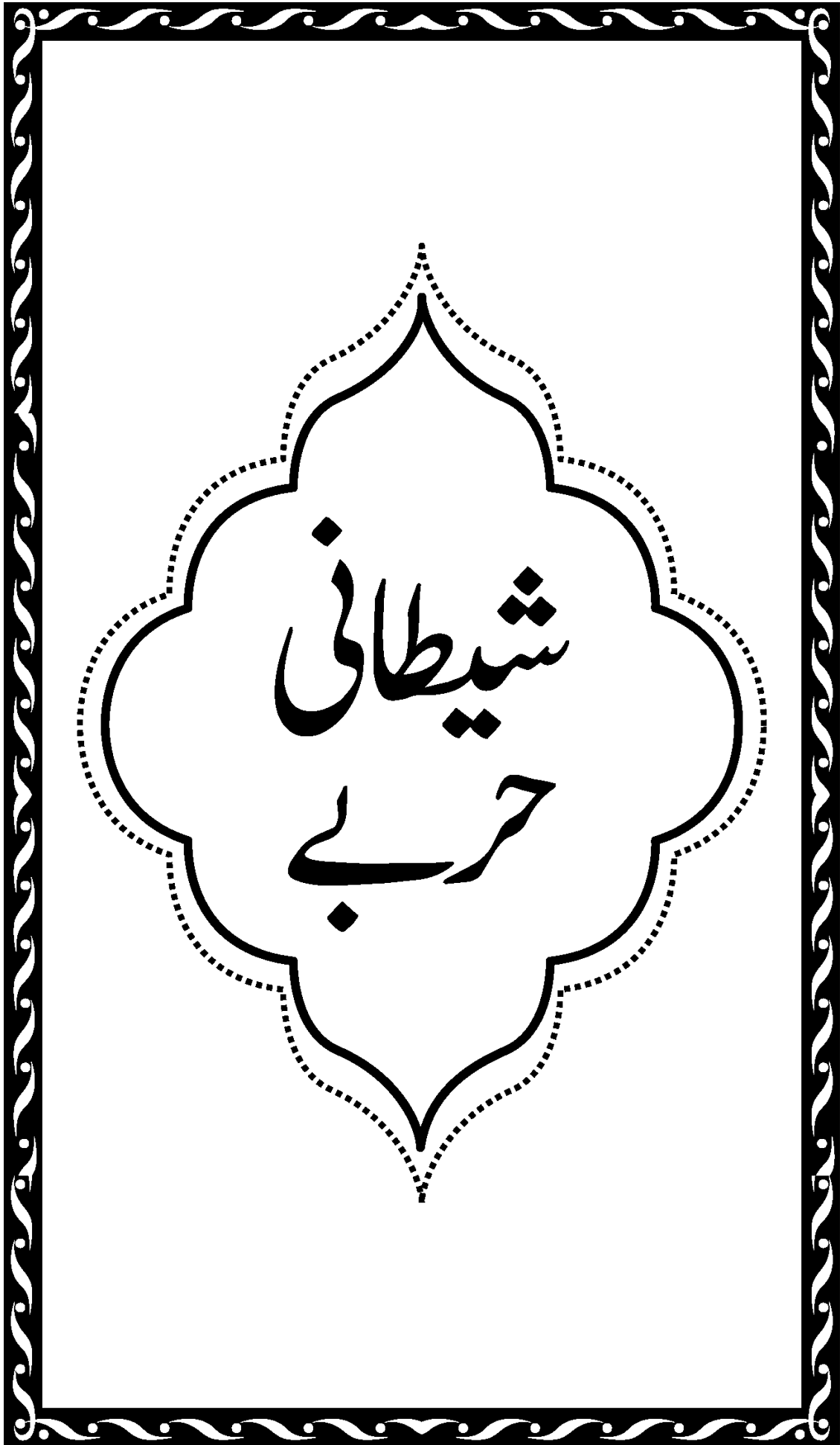
شیطانی حربے

أعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم،بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم.

﴿ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ط ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ﴾

(آل عمران: ۱۴)

(خوشنما بنادی گئی ہے لوگوں کے لیے خواہشوں کی محبت؛ یعنی عورتیں اور بیٹے اور بڑے بھاری مال سونے کے اور چاندی کے اور نشان لگائے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتیاں، یہ دنیا والی زندگی کا فائدہ اٹھانا ہے اور اللہ کے پاس ہے اچھا ٹھکانہ)

حضرات! ایک آیت آپ کے سامنے تلاوت کی گئی ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے "حب الشھوات" یعنی دنیا کی جو لذتیں اور خواہشیں اور انسان کے دل کو اپیل کرنے والی چیزیں ہیں، یہ انسان کے لیے مزین کردی گئی ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے "حب الشھوات" کی تفسیر بیان کی کہ حب الشھوات سے مراد، یہ دنیا کی مختلف چیزیں؛ یعنی بیویاں ہیں، بچے ہیں، مال ہے، دولت ہے، سونا ہے، چاندی ہے، پیسہ ہے، یہ ساری چیزیں دنیا کی چیزیں ہیں۔ اللہ نے ان کا لقب رکھا ہے: "الشھوات" اور فرمایا کہ ان خواہشات کی محبت انسان کے لیے مزین کردی گئی ہے۔

لفظِ ''زُیِّنَ'' استعمال کیوں فرمایا؟

یہاں ''زُیِّنَ'' کا لفظ یہ بتارہا ہے کہ حقیقت میں دنیا کی یہ چیزیں ایسی نہیں ہیں، جیسی نظر آتی ہیں، اگر حقیقت میں بھی ایسی ہوتیں، تو پھر لفظِ مزین لانے کی کوئی ضرورت ہی نہ ہوتی؛ کیوں کہ جو چیز ہو کالی، اسے آپ کچھ رنگ، روغن، مسالہ لگا کر بنادیں گوری، تب کہا جائے گا کہ مزین کر دیا گیا ہے، آج کل لوگ ملمع سازی کرتے ہیں، کوٹنگ (COATING) کرتے ہیں، بہت ساری چیزوں کی کوٹنگ ہوتی ہے، لوہے کی کوٹنگ کی اور سونے کا پانی اس پر چڑھا دیا، دیکھنے میں ایسا لگ رہا ہے، جیسا کہ سونا ہوتا ہے، آج کل عورتوں کے زیورات بھی ایسے آنے لگے ہیں۔ آپ دیکھیں، تو ایسے معلوم ہوں جیسے کہ یہ واقعی سونا ہیں؛ لیکن حقیقت میں یہ سونا نہیں ہے؛ بل کہ سوجانا ہے، کوئی طاقت نہیں ہے اس کے اندر؛ لیکن دیکھنے میں بالکل ایسا ہی لگے گا جیسے کہ سونا ہو، اسی طرح مختلف چیزوں پر رنگ وروغن مسالہ لگا کر اس کو مزین کر دیا جاتا ہے، ملمع سازی کرنے کے بعد دیکھنے میں چیزیں اچھی لگتی ہیں؛ حالاں کہ حقیقت میں یہ چیزیں کچھ اور ہوتی ہیں۔

اسی طرح دنیا کی جو چیزیں آپ کو نظر آتی ہیں، چاہے وہ عورتیں ہوں، چاہے تمھاری اولاد ہو، چاہے مال ہو، دولت ہو، سونا ہو، چاندی ہو، یہ سب کی سب چیزیں جو تم کو بہت بھلی اور اچھی لگتی ہیں، پیاری لگتی ہیں، یہ دراصل سب کوٹنگ کی ہوئی چیزیں ہیں، مزین کر دی گئی ہیں، ان کی اصلیت وہ نہیں ہے، جو نظر آرہی ہے۔ اس جانب توجہ دلانے اور اشارہ کرنے کے لیے یہاں لفظِ ''مزین'' لایا گیا۔

اگر ان چیزوں کی حقیقت انسان کے سامنے کھل جائے، تو خدا کی قسم وہ اِن چیزوں کو دیکھنا بھی گوارہ نہ کرے۔ وہ کہے گا کہ یہ چیزیں دیکھنے کے قابل

ہیں؟ دیکھنے کے بھی قابل نہیں ہیں؛ لیکن اس کے باوجود انسان چوں کہ مزین کردہ چیزوں سے متاثر ہوجاتا ہے؛ اس لیے ان چیزوں کے اوپر فریفتہ ہوتا رہتا ہے۔ سونا دیکھا منہ میں پانی آ گیا، چاندی دیکھا رال ٹپکنے لگی، روپیہ اور پیسہ سامنے آیا، دل اس کے اوپر رپھسنے لگا اور مختلف قسم کی چیزیں دیکھیں، دل ان کے اوپر آ گیا؛ لیکن حقیقت میں یہ چیزیں اس قابل نہیں ہیں کہ ان سے دل لگایا جائے اور ان پر فریفتہ ہوا جائے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ دنیا کی چیزیں انسان کے لیے مزین کردی گئی ہیں۔ آگے چل کر اللہ تعالیٰ نے خود ہی فرمادیا ہے: ﴿ذٰلِکَ مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا﴾ (یہ تو دنیا کی چیزیں ہیں، دنیا کا ساز و سامان ہے) اور اصل چیز، وہ تو اللہ تعالیٰ کے پاس میں رکھی ہوئی ہے، جو حقیقت کے اعتبار سے بھی اچھی ہے اور بھلی ہے، یہاں تو جو کچھ بھی نظر آتا ہے، یہ صرف دیکھنے میں اچھا معلوم ہوتا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی دنیا کو مزین کر کے پیش کیا گیا تھا

حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج تشریف لے گئے، تو اس موقعے پر ایک واقعہ پیش آیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک عورت آئی اور مزین تھی، اپنے آپ کو اس نے آراستہ پیراستہ کیا تھا، زیورات کے ساتھ اور مختلف زیب و زینت کی چیزوں کے ساتھ، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھتی ہوئی آئی، اللہ کے نبی علیہ السلام نے چہرہ پھیرلیا؛ پھر دوبارہ بھی آئی، اللہ کے نبی علیہ السلام نے پھر چہرہ پھیرلیا، تیسری دفعہ بھی ایسا ہی ہوا۔ جبرئیل امین علیہ السلام نے آگے بڑھنے کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت

کیا، یارسول اللہ! آپ نے پہچانا کہ یہ عورت کون تھی؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ نہیں میں نے نہیں پہچانا، کون تھی یہ عورت؟ جبرئیل امین علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ عورت نہیں؛ بل کہ دراصل دنیا تھی اور یہ بوڑھی ہو چکی ہے؛ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو آراستہ، پیراستہ، مزین کر کے آپ کو بہکانے کے لیے آئی تھی۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ اس کی طرف نظر بھی نہیں فرمائی، اگر آپ خدانخواستہ اس عورت کو دیکھ لیتے، تو آپ کی پوری امت ہلاک ہو جاتی۔ (تفسیر ابن کثیر: ۵/۳)

اس ناپاک دنیا کو اللہ کے نبی علیہ السلام نے دیکھا نہیں اور امت کا یہ حال ہے کہ وہ اس میں ملوث ہے اور اگر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم دیکھ لیتے، تو پھر کیا ہوتا؟ اس سے اندازہ کیجیے کہ آج ہم لوگوں کے اندر کتنا قصور اور فتور پیدا ہو گیا ہے اور ایمانی اعتبار سے کس قدر کمزوری آ گئی ہے کہ ہمارے نبی نے جس کو دیکھا تک نہیں، آج ہم اسی کے اندر پوری طرح ملوث ہو گئے ہیں، اسی مال کے لیے، پیسے کے لیے، اسی دنیا کے لیے، زیب وزینت کی چیزوں کے لیے، انسان اپنا سب کچھ خرچ کر دیتا ہے، اپنی جوانی لگا دیتا ہے، اپنی ساری طاقت گنوا دیتا ہے، اپنی آنکھوں کی طاقت، کانوں کی طاقت، دل کی طاقت، دماغ کی طاقت، سب اسی کے پیچھے لگایا ہوا ہے، بس ہر وقت اسی فکر میں ہے کہ کس طرح کماؤں، کس طرح جمع کروں، کس طرح کھاؤں، کس طرح گنواؤں؟ پھر اسی اُدھیڑ پن میں پوری زندگی گزر جاتی ہے، جب کہ یہ دنیا اس قابل تھی کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح اس کے ساتھ برتاؤ کیا ہمیں بھی اسی طرح برتاؤ کرنا چاہیے تھا کہ ہم اس کی طرف نہ دیکھتے، منھ پھیر لیتے؛ لیکن اس کے تزین وملمع کاری نے ہم لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے؛ اس لیے انسان دنیا کی چیزوں کی طرف لپکتا چلا جاتا ہے۔

''زُیِّنَ'' صیغۂ مجہول لانے کی عجیب حکمت

یہاں ایک اور بات سنتے چلیے ، وہ یہ کہ اس آیتِ کریمہ میں ''زُیِّنَ'' کا جولفظ آیا ہے ،عربی پڑھنے والے جانتے ہیں کہ یہ مجہول کا صیغہ ہے ،مجہول میں اصل فعل مجہول نہیں ہوتا؛ بل کہ فاعل مجہول یعنی نا معلوم ہوتا ہے۔ بظاہر تو کہتے ہیں فعل مجہول،حقیقت میں وہ فاعل مجہول ہے۔فعل تو نظر آرہا ہے،معلوم ہورہا ہے ،وہ مجہول کہاں ہے؟ وہ فعل تو یہاں بھی معلوم ہوگیا کہ وہ ''تزین وملمع کاری'' ہے،تزئین ہے، زیب وزینت ہے۔ یہ تو خود ہی پتہ چل رہا ہے ،جس چیز کا پتہ ہو، وہ مجہول کہاں ہے؟ وہ تو معروف ہے،ہاں ! یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ مزین کرنے والا کون ہے،اس کو مجہول رکھا گیا ہے۔کیوں؟

اس کو سمجھنے سے پہلے ایک بات سمجھ لیں کہ قرآن کریم میں ''تزئین کاری'' کا ذکر اور جگہ بھی آیا ہے اور بعض جگہ اس کا فاعل بھی بتایا گیا ہے،نیکی کے سلسلے میں اللہ تبارک وتعالیٰ کو فاعل بتایا ہے،جیسے فرمایا کہ ﴿وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ (اور لیکن اللہ نے ایمان کو تمھارے نزدیک محبوب بنایا اور اس کو تمہارے قلوب میں مزین کردیا) اور برائی کے موقعے پر شیطان کو اس کا فاعل کہا ہے،جیسے فرمایا کہ ﴿وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ﴾(اور یاد کرو !جب کہ شیطان نے ان کے برے اعمال کو ان کے لیے مزین کیا)

(الانفال:۴۸)

مگر یہاں اس آیت میں اللہ تعالیٰ تزئین کاری کے فاعل کو مجہول کے صیغے میں چھپا دیا، کیوں؟ اس کی وجہ بندے کے نزدیک یہ معلوم ہوتی ہے کہ دنیا اور دنیا کی چیزیں جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، یہ مطلقاً نہ بُری ہیں، نہ مطلقاً اچھی؛ بل کہ اگر ان کو

خدا کے حکم و رسول کی تعلیم کے مطابق استعمال کیا جائے، تو اچھی ہیں اور یہی چیزیں آخرت کا وسیلہ بن جاتی ہیں اور اگر ان چیزوں کا خدا کے حکم اور رسول کی تعلیم کے مطابق استعمال نہ کیا جائے، تو یہ بُری اور وبالِ جان بن جاتی ہیں؛ لہٰذا ان چیزوں میں ایک پہلو بھلائی کا ہے؛ لہٰذا اس پہلو سے ان چیزوں کا مزین ہونا اللہ کی جانب منسوب ہوگا اور ایک پہلو اِن میں برائی کا ہے اور اس لحاظ سے ان کا مزین ہونا شیطان کی جانب منسوب ہوگا؛ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کام کے فاعل کو مجہول کردیا، تاکہ دونوں پہلو کی جانب اشارہ ہوسکے۔

اس تقریر سے ایک بہت بڑی حقیقت سامنے آگئی، وہ یہ کہ دنیا فی نفسہ نہ اچھی ہے نہ بُری؛ بل کہ اگر اللہ کے حکم کے مطابق استعمال ہو، تو اچھی ہے ورنہ بری ہے۔ ہاں! عام طور پر چوں کہ اس کا استعمال لوگ غلط طور پر کرتے ہیں اور اس کے ذریعے شیطان بہکاتا ہے؛ اس لیے اس کو بُرا کہا جاتا ہے۔

”عورت“ شیطان کا ایک حربہ

بہ ہر حال! اب اس پر غور کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں آیتِ کریمہ میں ”شہوات“ کی تفسیر میں جو چیزیں بیان کی ہیں ان میں سے ایک ”عورتیں“ ہیں، جن کو شیطان مُلَمَّع کاری کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ شیطان گمراہ کرنے کے لیے عورت کو اپنا ایجنٹ (AGENT) بناتا ہے۔ ایک بزرگ حسن بن صالح رَحِمَہُ اللّٰہُ فرماتے ہیں کہ میں نے شیطان کو سنا کہ وہ عورت سے کہہ رہا تھا کہ ” أنتِ نصف جندي، أنتِ سهمي الذي أرمي به فلا أخطأ و أنتِ موضع سري ، و أنتِ رسولي في حاجتي“ (تو میری آدھی فوج ہے اور تو میرا وہ تیر ہے، جس سے میں شکار کرتا ہوں، میں خطا نہیں کرتا اور تو

میری راز دار اور حاجت کے وقت میری قاصد ہے)

(مکائد الشیطان ، ابن ابی الدنیا: ۵۹)

اور حدیث میں بھی یہ مضمون موجود ہے کہ نبی اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ ”النساء حبائل الشیطان“ (عورتیں شیطان کے شکار کا آلہ ہیں)

(جامع الأصول :حدیث : ۸۴۸۰)

عورت کے ذریعے شیطان انسان کو پھانسنے کی ، گمراہی میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بہت حد تک کامیاب ہو جاتا ہے، بڑے بڑے لوگ پھنس جاتے ہیں، کبھی ایمان کھو دیتے ہیں ،صرف لذت کی وجہ سے،خواہش کی وجہ سے اور یہ چیز انسان کو کبھی اندھا بنا دیتی ہے، کبھی بہرہ بنا دیتی ہے، کبھی گونگا بنا دیتی ہے۔جیسے حدیث میں ہے کہ ”حُبُّکَ الشَّيْءَ یُعْمِيْ وَیُصِمُّ“ (کسی چیز کی محبت انسان کو اندھا و بہرا بنا دیتی ہے) (شعب الإیمان: ۳۶۸/۱)

اس لیے انسان بے سوچے سمجھے، اندھا، بہرا ہو کر عورت پر فریفتہ ہو جاتا ہے، اس کو خود بھی اس کا عیب نظر نہیں آتا اور دوسرے اس کو سمجھائیں، بتائیں، تو وہ بہرا بن جاتا ہے۔

دنیا کی عورتوں اور جنت کی حوروں کا فرق

دنیا کی عورتوں کو شیطان ملمع کاری کے ذریعے حسین دکھاتا ہے؛ جب کہ انسان کو غور کرنے سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ دنیا کی عورت میں کس قدر کھوٹ و عیب ہے۔قرآن کریم نے اسی لیے دنیا کی عورتوں کے مقابلے میں جنت کی حوروں کا تذکرہ کر کے ان کے فرق کو بتایا ہے؛ تاکہ شیطان کی ملمع سازی اور تزیین کاری کو پہچانا جائے۔

اس سلسلے میں غور و فکر کے لیے قرآن کریم میں بعض جگہ اشارات دیے گئے

ہیں؛ چناں چہ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے بعض جگہ جنت کے ذکر میں فرمایا:
﴿لَهُمْ فِيهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ﴾ (البقرۃ:۲۵،النساء:۵۷)
یعنی جنت میں جنتیوں کو جو بیویاں، حوریں ملیں گی، وہ مطہر یعنی پاکیزہ بیویاں ہوں گی، پاکیزہ بیویاں، جن کے اندر نجاست نہیں، گندگی کا نام ونشان نہیں، بالکل پاک وصاف۔

یہ طہارت دوقسم کی ہے: ایک ظاہری طہارت اور ایک باطنی طہارت۔ظاہری طہارت کیا؟ پاخانہ نہیں ہوگا، پیشاب ان سے نہیں نکلے گا، پسینہ نہیں نکلے گا، اسی طرح اور جو مختلف قسم کے فُضلات انسان کے جسم سے نکلتے ہیں، جو کبھی نفرت کا باعث بنتے ہیں،ان ساری چیزوں سے جنت کی حوریں پاک ہوں گی اور باطنی اعتبار سے مطہرہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دل کے اعتبار سے بھی بہت پاکیزہ ہوں گی، اخلاق کے اعتبار سے بھی بہت پاکیزہ ہوں گی،ان کے اندر کوئی عیب نہ ہوگا؛ یہ اس کا مطلب ہے۔

سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر اتنا بھی فرمادیے ہوتے: ﴿ فِيهَا اَزْوَاجٌ ﴾ (جنت میں بیویاں ملیں گی) تو بات کافی ہوجاتی ؛لیکن "مطھرہ" کہہ کر بتانا یہ چاہتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لیے غور کرو کہ دنیا کی عورتوں کا کیا حال ہے؟ آدمی عورت کو بہت پسند کرتا ہے؛ حالاں کہ اسے پاخانہ بھی لگتا ہے، اس سے پیشاب بھی نکلتا ہے، ماہواری خون بھی جاری ہوتا ہے اور گندگیاں بھی ہوتی ہیں اور غسل نہ کرے، تو بدن کے اندر بدبو پیدا ہوجاتی ہے، منھ اگر نہ دھوئے، تو منھ کے اندر بدبو پیدا ہوجاتی ہے، گویا ساری گندگیوں کا مرکز اور معدَن بن جاتی ہے۔ یہ ہے دنیا کی عورت کا حال، جس پر تم فریفتہ ہوتے ہو۔

اور رہی اخلاق اور کردار کے اعتبار سے، تو وہ معلوم ہی ہے، اسے تو کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ یہاں کی عورتوں کا کیا حال ہوتا ہے، بداخلاقی، بدزبانی، ناشکری، ان کے اندر عیوب ہی عیوب ہوتے ہیں۔

تو دیکھیے بظاہر عورت دیکھنے میں اچھی لگتی ہے، انسان اس کی طرف مائل ہو جاتا ہے؛ لیکن یہ مُلمّع سازی ہے، تزئین کاری ہے؛ لیکن حقیقت کے اعتبار سے عورت ساری گندگیوں کا مرکز اور معدن ہے۔

شیطان کا دوسرا حربہ ''اولاد''

اس آیت میں دوسری چیز جو'' شہوات'' کی تفسیر میں آئی ہے، وہ ہے: ''البنین''، یعنی اولاد، جس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان اولاد کو مزین کر کے ماں باپ کو دکھاتا ہے اور وہ ان کی محبت میں اس طرح گرفتار ہو جاتے ہیں کہ اندھے، بہرے بن جاتے ہیں اور کبھی حلال و حرام کی تمیز کھو بیٹھتے ہیں اور کبھی احکامِ شریعت سے لاپرواہی برتتے ہیں؛ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اولاد کی وجہ سے آدمی جہنم میں جا گرتا ہے۔ اسی لیے قرآن نے اولاد کو بھی مال کی طرح ایک فتنہ قرار دیا ہے ۔ فرمایا کہ ''وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ''(الأنفال:۲۸)(جان لو کہ تمھارے اموال اور اولاد فتنہ ہیں) اور علامہ قاضی عیاض رَحِمَہُ اللّٰہُ فرماتے ہیں کہ فتنے کے اصل معنے تو امتحان و آزمائش کے ہیں؛ لیکن عرف میں امتحان کے بُرے نتیجے کو فتنہ کہتے ہیں۔ (الإكمال المعلم : ۱/ ۲۹۸)

لہٰذا اولاد کے سلسلے میں انسان اللہ کی آزمائش میں عموماً بُرا نتیجہ لاتا ہے یعنی ناکام ہو جاتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ '' اَلْوَلَدُ

مَجْبَنَۃٌ مَبْخَلَۃٌ مَجْھَلَۃٌ“(اولاد انسان کو بزدل، بخیل اور جاہل بناتی ہے)
(اتحاف الخیرۃ: ۶۷۶۳، مصنف عبد الرزاق: ۲۰۱۴۳)

اور ایک روایت میں ” مَحْزَنَۃٌ “ (غم میں ڈالنے والی) کا اضافہ ہے۔اس حدیث کی شرح میں علامہ مناوی رَحِمَہُ اللّٰہ نے لکھا ہے کہ اولاد ”بخیل“ بناتی ہے؛ کیوں کہ اولاد کی وجہ سے ماں باپ نیکی وقرب کے کاموں میں خرچ کرنے سے کنجوسی کرتے ہیں۔”بزدل“ بناتی ہے؛ کیوں کہ اولاد کی محبت میں باپ جہاد میں جانے اور اللہ کے لیے ہجرت کرنے سے باز رہتا ہے۔”جاہل“ بناتی ہے؛ کیوں کہ اولاد کی محبت اور اس کے لیے نان، نفقے کی فکر اس کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے سفر سے روکتی ہے اور وہ جاہل ہی رہ جاتا ہے۔”غم“ میں ڈالنے والی ہے؛ کیوں کہ اولاد کبھی بیمار ہو یا کوئی اور چیز کا مطالبہ کرے، جس کو والدین پورا نہ کرسکیں، تو وہ اس کی وجہ سے غمگین ہوتے ہیں۔ (التیسیر: ۶۱۵/۱، فیض القدیر: ۲۶۲/۶)

بہ ہر حال یہ اولاد کا فتنہ بھی بڑا سخت وشدید فتنہ ہوتا ہے؛ مگر کب؟ اس وقت جب انسان اولاد کی محبت میں اندھا، بہرا ہوجاتا ہے۔اس صورت میں یہ اولاد شیطان کا ایک حربہ ہے، جس سے وہ لوگوں کو مات دیتا ہے۔

”دنیا کا ساز وسامان“ تیسرا شیطانی حربہ

اس آیتِ کریمہ میں تیسری چیز ”شہوات“ کی تفسیر میں دنیا کے مال ومتاع اور مختلف قسم کے ساز وسامان کو بیان کیا گیا ہے۔فرمایا کہ ﴿وَالْقَنَاطِیْرِ الْمُقَنْطَرَۃِ مِنَ الذَّھَبِ وَالْفِضَّۃِ وَالْخَیْلِ الْمُسَوَّمَۃِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ﴾

(آل عمران)

یہ ساز وسامان، سونا چاندی، گھوڑے، چوپائے اور کھیتیاں بھی انسان کو مزین

کر کے دکھایے جاتے ہیں، جس سے وہ دھوکے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ یہ چیزیں بڑی لائق و فائق ہیں، بڑی بہترین و عمدہ ہیں؛ حالاں کہ ان کی برائی و قباحت اس قدر ہے کہ وہ اپنانے کے قابل نہیں ؛مگر شیطان ان کو اس طرح مزین کر دیتا ہے کہ انسان خواہ مخواہ ہی ان کی جانب میلان کرتا ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ یہ مال و متاع درحقیقت ایسا ہے جیسے پیشاب کے ڈھیلے کہ ضرورت پر ان کا استعمال لازم ہے؛ مگر ان سے محبت کرنا، ان کو گلے سے لگانا اور ہر وقت ان ہی کی فکر میں لگا رہنا، بڑی کم عقلی و بے وقوفی کی بات ہے۔

متاع کی تفسیر اور صاحب بن عباد رَحِمَہُ اللّٰہُ کا واقعہ

اسی لیے یہاں قرآن نے دنیا کے ساز و سامان کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ ﴿ذٰلِکَ مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا﴾ (یہ سب دنیوی زندگی کا سامان ہے) یہاں سامان کے لیے ''متاع'' کا لفظ آیا ہے اور ''متاع'' حقیر قسم کی چیز و سامان کو کہتے ہیں۔ صاحب بن عباد رَحِمَہُ اللّٰہُ ایک بہت بڑے عالم و ادیب گزرے ہیں، اپنے وقت میں ''مؤید الدولہ بن رکن الدولہ'' کے وزیر بھی تھے، بڑے لغوی اور عربی زبان کے ادیب تھے۔ ان کا واقعہ ہے کہ ایک بار ان کو اس لفظ کی تحقیق کی ضرورت پڑ گئی۔ انھوں نے سوچا کہ عربی زبان کی اصل کو معلوم کرنے دیہاتوں میں جانا چاہیے؛ کیوں کہ وہاں زبان اپنی اصلیت پر باقی رہتی ہے، برخلاف شہروں کے کہ وہاں مختلف علاقوں کے لوگوں سے میل جول کی وجہ سے عربی زبان اپنی اصلیت پر باقی نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں مختلف گاؤں دیہاتوں میں اس لفظ کے معنے جاننے کے لیے گھومتا رہا، ایک جگہ دیکھا کہ ایک دیہاتی عربی لڑکا بیٹھا ہے، میں اس کے پاس چلا گیا اور اس کے بازو بیٹھ گیا اور اس کے قریب ایک کپڑا پڑا ہوا تھا، جو زمین

وغیرہ پوچھنے اور صاف کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اتنے میں ایک کتا آیا اور وہ پوچھنے کا کپڑا اٹھا کر لے گیا۔ کچھ دیر بعد اس لڑکے کی ماں آئی، تو اس لڑکے نے ماں سے کہا کہ ”جاء الرقیم و أخذ المتاع و تبارک الجبل“ (کہ کتا آیا اور متاع اٹھایا اور پہاڑ پر چڑھ گیا) علامہ صاحب بن عباد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس سے مجھے سمجھ میں آیا کہ متاع کی کیا حقیقت ہے؟ اس لڑکے نے پوچھنے کے کپڑے کے لیے جو ایک معمولی وحقیر چیز ہوتی ہے اور سجانے کے لیے نہیں؛ بل کہ چھپانے کے قابل ہوتی ہے، اس کو متاع کہا؛ لہٰذا متاع کے معنے یہ ہوئے کہ جو چیز ضرورت کی ہو، مگر حقیر ہو، معمولی درجہ کی ہو، جیسے پوچھنے کا کپڑا، اس کو عربی میں متاع کہتے ہیں۔

اللہ اکبر! قرآنِ کریم میں دنیا کے ساز وسامان کے لیے یہ لفظ لا کر یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا کا یہ مال ودولت اگر چہ کہ ایک ضرورت کے لیے ہے؛ مگر وہ دل لگانے اور شوکیس میں سجانے اور لوگوں کو دکھانے کے قابل نہیں ہے۔ کیا کوئی پوچھنے کے کپڑے کو شوکیس میں سجاتا ہے؟ کیا کوئی اس کو دل سے لگاتا ہے، اس سے محبت کرتا ہے؟ نہیں! اسی طرح دنیا کو بھی سمجھنا چاہیے۔

الغرض! یہ دنیا بھی مزین کر کے شیطان لوگوں کو دھوکہ دیتا ہے اور اس کو اپنے ایک حربے کی طرح استعمال کرتا ہے۔

دنیا کے ذریعے شیطان کس طرح بہکاتا ہے؟

اس پر ایک واقعہ یاد آیا کہ ایک دفعہ ایک آدمی نے دیکھا کہ ایک جگہ درخت ہے اور لوگ اس درخت کی پوجا کر رہے ہیں، تو اس آدمی کے دل کے اندر ایک عزم ایک حوصلہ پیدا ہوا کہ اس درخت کو اکھاڑ دینا چاہیے؛ اس لیے کہ یہ درخت لوگوں کو

اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف آنے سے مانع بن رہا ہے اور اس کے بہ جائے شرک و گمراہی اور کفر میں پھنسنے کا ذریعہ بن رہا ہے۔

چناں چہ وہ شخص کچھ ہتھیار لے کر گیا اور درخت کو اکھاڑنا شروع کیا، شیطان آیا اور کہنے لگا کہ کیا کر رہے ہو؟ تو اس نے کہا کہ میں اس درخت کو اکھاڑنا چاہتا ہوں، اس لیے کہ اس درخت کی وجہ سے بہت سے اللہ کے بندے کفر میں پھنس رہے ہیں، اور شرک کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ شیطان نے کہا کہ نہیں نہیں! تم ایسا مت کرو، اس کو یہاں کے لوگوں نے اب تک پالا اور بڑھایا ہے اور اس کے پیچھے ہم نے محنت کی ہے۔ مگر اس شخص نے کہا کہ نہیں نہیں! میں تو اللہ کے لیے آیا ہوں اور یہ کام میں کر کے رہوں گا۔ اس نے اپنا پورا عزم بتایا، پورا حوصلہ بتایا۔ جب شیطان نے اس کا یہ عزم دیکھا، تو اس کی ہمت اور طاقت کے مقابلے میں شیطان مجبور ہو گیا؛ (اس لیے کہ اخلاص کے ساتھ جب عمل ہوتا ہے، تو اس کے اندر بڑی قوت ہوتی ہے اور شیطان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا)، تو شیطان عاجز آ گیا۔ پھر سوچنے لگا کہ کس طرح اس کو اس نیکی سے روکوں؟ اس کی سمجھ میں ایک بات آ گئی، شیطان نے اس سے عاجزی سے کہا کہ میری ایک درخواست ہے اس کو سن لیں۔

اس نے کہا کیا درخواست ہے؟ شیطان نے کہا کہ درخواست یہ ہے کہ تم اس کام کو چھوڑ دو، تو میں روزانہ تمھیں دو درہم دے دیا کروں گا، دو درہم روزانہ بغیر کسی محنت، مزدوری گھر بیٹھے مل جائیں گے۔

یہ سنا تو دل میں دنیا کی لالچ آ گئی، اس نے کہا کہ اچھا دو درہم مجھے روزانہ ملیں گے، کون اس کا ذمہ دار ہوگا؟ شیطان نے کہا میں ذمہ دار ہوں، میں تجھے پیش کروں گا اور پیش بھی اس طرح کروں گا کہ روزانہ فجر کی نماز پڑھ کر مصلے سے اٹھیں گے، تو

تمھارے مصلے کے نیچے مل جائیں گے۔

اس نے کہا ٹھیک ہے دیکھتے ہیں۔ اب جو عزم لے کر آیا تھا، مال، پیسے کی وجہ سے وہ ختم ہو گیا اور واپس اپنے گھر چلا گیا، رات سو کر صبح اٹھا، فجر کی نماز پڑھی اور اس کے دل و دماغ میں وہی دو درہم تھے، مصلے کے پاس گیا اور دیکھا، تو واقعی مصلے کے پاس دو درہم اس کو مل گئے، اٹھایا اور جیب میں ڈال لیا، اور اس کے بعد دن بھر اپنے کام میں مصروف رہا؛ پھر دوسرا دن ہوا، اسی طرح فجر کے بعد مصلے کے پاس دو درہم مل گئے۔

اب روزانہ یہی تماشا ہوتا ہے کہ فجر پڑھ کے وہاں جاتا ہے، دو درہم مل جاتے ہیں، مہینہ دو مہینے تک یہ سلسلہ چلتا رہا، اس کے بعد شیطان نے درہم دینا بند کر دیا۔ اب جب دو درہم نہیں ملے، تو یہ شخص پھر اپنے ہتھیار وغیرہ لے کر وہاں پہنچا کہ درخت کو اکھاڑ دوں گا، شیطان بھی وہاں موجود تھا، جب اس نے وہ درخت اکھاڑنا چاہا، تو شیطان نے کہا: کیا کر رہے ہو؟ کہا: درخت اکھاڑوں گا؛ اس لیے کہ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ دو، دو درہم دیا کروں گا، کئی دنوں سے تم نے دیا نہیں، اب میں پھر وہی کام کروں گا، جو پہلے کرنے آیا تھا۔ شیطان نے کہا کہ کر لے جو کرنا ہے؛ لیکن تجھے اس پر کوئی قدرت نہ ہوگی۔ اس نے کہا کہ کیوں؟ کہا کہ تو پہلے آیا تھا اللہ کے لیے، اب آیا ہے پیسے کے لیے، وہاں اخلاص موجود تھا اور یہاں اخلاص موجود نہیں ہے، اب تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد وہ آدمی اپنا منھ لے کر رہ گیا۔

بھائیو! اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کس طرح اپنے پھندے میں پھانسنے کے لیے لوگوں کو مال سے، پیسے سے، اپنی طرف مائل کرتا ہے۔

ایک بڑا شیطانی حربہ ''جہالت'' ہے

شیطان کا ایک مکر اور سب سے بڑا حربہ جہالت کی راہ سے ہوتا ہے۔ جب شیطان آدمی کو دیکھتا ہے کہ جاہل ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کے پاس صحیح علم نہیں اور اسے معلوم نہیں کہ حقیقت کیا ہے؟ اللہ کے بارے میں صحیح نہیں جانتا، رسول کے بارے میں صحیح نہیں جانتا، آخرت کے بارے میں نہیں جانتا، فرشتوں کا علم نہیں ہے، اسی طرح دینی معلومات کے اندر اس کے پاس کمی موجود ہے، تو شیطان اس جہالت سے بہت فائدہ اٹھاتا ہے اور عام طور پر جاہلوں کو ان کی جہالت کی وجہ سے بڑی بڑی قبیح ترین اور انتہائی ناروا باتوں کے اندر پھانس دیتا ہے۔

اسی لیے علما نے لکھا ہے کہ مکر کے لیے اور فریب کے لیے سب سے بڑا راستہ جہالت ہوتا ہے اور اگر آدمی کے اندر جہالت کے بہ جائے علم ہو، تو علم کے ذریعے سے وہ شیطان کے مکر کو، کید کو سمجھنے لگتا ہے اور شیطانی حربے سے بچ جاتا ہے اور کام یاب ہو جاتا ہے۔

اسی مضمون کی طرف ایک حدیث کے اندر اشارہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: '' فقيه واحد أشد على الشيطان من ألف عابد'' (ایک فقیہ و عالم شیطان پر ایک ہزار عابدوں سے بھاری ہے)

(ابن ماجه: ۲۰، ترمذي: ۲/۹۷)

ایک طرف ایک ہزار عابد ہوں، شیطان کہتا ہے کہ ان سب کو میں ایک داؤ میں نیچا دکھادوں گا؛ اس لیے کہ یہ لوگ عبادت تو کر رہے ہیں؛ لیکن ان کے پاس علم نہیں ہے، ہاں! عبادت ہے، ریاضت ہے، مجاہدہ ہے، سب کچھ ہے؛ لیکن علمِ شریعت نہ ہونے کی وجہ سے ایک داؤ میں ان کو گرادوں گا۔

لیکن اگر کوئی عالم ہوتا ہے، تو وہ عالم سے ڈرتا ہے؛ لیکن یہ نہ سمجھیے کہ ڈر کر وہ پیچھے رہ جاتا ہے، جی! ڈرتا تو ہے؛ لیکن ڈرنے کے ساتھ کوشش یہ کرتا ہے کہ کوئی بڑا مکر ان کے لیے لاؤں۔ دوسروں کو تو چھوٹی چھوٹی چیزوں سے ہلاک کرتا رہتا ہے؛ لیکن علما کو بڑے بڑے مکر سے ہلاک کرتا ہے۔ تو اس لیے علما بھی بے خبر نہیں رہ سکتے۔

جاہل پر شیطان کا داؤ-ایک قصہ

ایک بہت بڑے عالم گزرے ہیں، امام ابنِ عبد البَر مالکی رَحِمَہُ اللہ، انھوں نے اپنی کتاب "جامع بیان العلم" میں ایک قصہ لکھا ہے کہ شیطان کے چیلوں نے شیطان سے کہا کہ جب کسی عالم کا انتقال ہوتا ہے، تو آپ بہت خوش ہوتے ہیں، کسی عابد وزاہد کی موت پر اتنا خوش نہیں ہوتے۔ کیا بات ہے؟

شیطان نے کہا کہ آؤ میں تم کو اس کی وجہ بتاتا ہوں۔ اس کے بعد شیطان اپنے چیلوں کو لے کر ایک عابد کے پاس گیا، جو جاہل تھا اور سلام کیا، خیر خیریت پوچھی، شیطان نے اس سے کہا کہ آپ بڑے اچھے آدمی لگتے ہیں، میرے دل میں ایک وسوسہ ہے، خیال ہے، سوال ہے، میں اس کے بارے میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ عابد نے کہا کہ پوچھیے اگر مجھے معلوم ہوگا، تو جواب دے دوں گا، اگر معلوم نہیں، تو آپ کسی اور سے پوچھ لیجیے۔

شیطان نے کہا کہ میرے دل میں ایک سوال پیدا ہو رہا ہے، وہ یہ کہ کیا اللہ تعالیٰ اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ ایک انڈے میں زمین کو، آسمان کو، چاند کو، سورج کو، پوری کائنات کو داخل کر دے؟ اس حالت میں کہ انڈا جتنا ہے اتنا ہی رہے، اس میں اضافہ نہ ہو اور یہ زمین و آسمان جتنی بڑی ہیں، اس میں کوئی کمی نہ ہو۔ یہ ذہن میں ایک سوال آرہا ہے، اس کے بارے میں آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں؟

بھائیو! ذرا اندازہ کیجیے سوال کا، وسوسے کا کہ کس قدر خطرناک ہے۔ اب وہ عابد تو جاہل و بے وقوف تھا ہی، صرف نماز، روزے کی باتیں تو جانتا تھا، باقی اتنا بڑا علم تو تھا نہیں۔ تو اس نے کچھ دیر سوچا، اس کے بعد کہنے لگا کہ انڈا اتنا ہی رہے اور زمین بھی اتنی ہی رہے اور آسمان بھی اتنا رہے، پھر انڈے میں یہ سب داخل ہو جائیں، کیسے ہو سکتا ہے؟ یعنی شک کے لہجے میں، تعجب کے انداز میں اس نے یہ سوال دہرایا، پھر کہنے لگا کہ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔

شیطان کے چیلے وہیں موجود تھے، شیطان نے ان سے کہا کہ میں نے اس کے دل میں شک کا بیج داخل کر دیا ہے، جو اسے کفر تک پہنچا دے گا۔ دیکھا کہ میں نے ایک منٹ میں اس عابد و زاہد کو کافر بنا دیا، یا کفر کی دہلیز پر بٹھا دیا؛ اس طرح کے لوگ زندہ رہیں یا مر جائیں، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اس کے بعد شیطان ایک عالم سے ملا، اس سے بھی یہی سوال کیا اور کہا کہ جناب آپ عالم ہیں، فاضل ہیں، میرے ذہن میں ایک سوال پیدا ہو گیا ہے، اس کا جواب دریافت کرنے آیا ہوں؟ انھوں نے کہا کہ کیا سوال؟ کہا کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک انڈے میں زمین و آسمان کو ڈال دیں؟ تو ان عالم نے کہا کہ اس میں کیا تعجب کی بات ہے کہ انڈا اپنی حالت پر اسی طرح ہو، زمین اور آسمان بھی اسی طرح ہوں، پھر اللہ تعالیٰ انڈے میں ان کو داخل کر دیں؟ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اللہ کی ذات تو وہ ہے کہ جب ارادہ کرتا ہے کسی چیز کا تو "کُنْ" فرماتا ہے اور وہ چیز ہو جاتی ہے۔ ﴿وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ (اور جب وہ (اللہ) کسی چیز کا فیصلہ کرتا ہے، تو اسے "کن" (ہو جا) کہتا ہے، تو وہ ہو جاتی ہے) اس لیے مجھے یقین ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے، اس میں کوئی بات شک وشبہ کی نہیں۔

شیطان نے اپنے چیلوں کو دیکھ کر کہا کہ دیکھو اس کا علم ایسا ہے کہ یہ ہمارے داؤ میں نہیں پھنس سکتا اور اس کو بہکانا ہمارے لیے آسان نہیں؛ اس لیے ان لوگوں کے زندہ رہنے سے مجھے پریشانی ہوتی ہے اور یہ لوگ مرتے ہیں، تو میں جشن مناتا ہوں اور عابد کا حال ایسا کہ اسے جب چاہیں ہم ادھر سے ادھر کر سکتے ہیں اور اس کی جہالت کی وجہ سے جب چاہے اس کو صرف معصیت میں نہیں، کفر میں بھی مبتلا کر سکتے ہیں۔ **(جامع بیان العلم)**

اس واقعے سے اندازہ کیجیے کہ جب آدمی کے اندر جہالت ہوتی ہے، علمِ شرع سے ناواقف ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے جاہ وجلال سے ناواقف ہوتا ہے، تو اس کے نتیجے میں انسان کس طرح کفر کے دَل دَل میں پھنس جاتا ہے، اس لیے علما نے لکھا ہے کہ جہالت سب سے بڑی بیماری ہے۔

سالک کا سب سے پہلا کام تحصیلِ علم ہے

یہیں سے میں سالکین سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ علمِ دین سے کبھی غافل نہ ہوں؛ کیوں کہ سالکینِ طریقت کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ وہ علمِ دین حاصل کریں؛ اسی لیے امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا"**من تصوف و لم یتفقه فقد تزندق؛ومن تفقه ولم یتصوف فقد تفسق؛ومن جمع بینهما فقد تحقق**" (جس نے تصوف اختیار کیا اور علم نہیں حاصل کیا وہ زندیق ہو گیا اور جس نے علم سیکھا، مگر تصوف اختیار نہیں کیا وہ فاسق ہو گیا اور جس نے دونوں کو جمع کیا وہ محقق ہو گیا) **(إیقاظ الهمم : ۲)**

حضرت سیدنا امام جنید بغدادی رحمہ اللہ جو ایک طرف حدیث کے امام بھی تھے، تو ایک طرف تصوف کے بھی امام تھے، وہ فرماتے ہیں کہ تصوف کی راہ قرآن اور

حدیث پر قائم ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس راہِ تصوف وسلوک کے اندر سب سے بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ علمِ شرع سے واقفیت ہو؛ لیکن علم شرع کا مطلب یہ نہیں کہ آپ پورے عالم و فاضل ہو جائیں، یہ کوئی ضروری نہیں؛ لیکن اتنا علم آدمی کے پاس ہونا چاہیے، جس سے کہ وہ حق و باطل میں تمیز کر سکے، اچھے اور بُرے کی پہچان اس کے اندر آ جائے، کھوٹ کیا ہے اور اصل کیا ہے، اس کو سمجھ میں آ جائے؛ اتنا علم اگر اس کے پاس موجود ہے، تو اس علم کے ذریعے وہ راہ کو طے کر سکتا ہے۔

لہٰذا علما کی خدمت میں جانا، شریعت سے واقف ہونا، ضروری امور سے واقف ہونا، عقائد سے واقف ہونا، انتہائی ضروری ہے، ان کے بغیر آدمی کا اس راہ میں چلنا دشوار ہے، ورنہ کہیں نہ کہیں آدمی کو شیطان دھوکہ دے دیتا ہے۔

ایک جاہل کی گمراہی کا قصہ

حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ نے ایک جگہ بیان کیا ہے کہ ان کے گاؤں میں ایک آدمی تھا، بڑا عابد تھا؛ لیکن علمِ دین سے واقف نہیں تھا۔ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہاں کے کچھ لڑکوں نے اس کا مذاق بنانا چاہا اور سوچا کہ اس آدمی کی بے وقوفی ظاہر کی جائے، ایک دن وہ اپنے گھر میں سو رہا تھا، رات کا وقت تھا، تو محلے کے دو چار لڑکے اس کی چھت پر چڑھ گئے اور بناوٹی آواز میں اس کا نام لے کر ایک خاص لب و لہجے میں اس کو پکارا۔ وہ چونکا اور پوچھنے لگا کہ کون ہے؟ ایک لڑکے نے آواز بنائی اور کہا کہ میں تمہارا خدا بول رہا ہوں۔ یہ سنتے ہی وہ جاہل اٹھ کر بیٹھ گیا، اس کے بعد کہنے لگا کہ اے باری تعالیٰ! کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ تو اس نے کہا کہ تیری عبادت مجھے بہت پسند آ گئی؛ اس لیے آج سے ہم نے تیرے سے نماز معاف

کردی ہے۔ یہ کہہ کر وہ لڑکے تو غائب ہوگئے۔

اب یہ جاہل عابد سمجھا کہ واقعی یہ اللہ تعالیٰ ہی کی آواز ہے، اس لیے اس کو یقین آگیا کہ نماز معاف ہوگئی۔ اب اس کے بعد جو تہجد تھی وہ بھی ختم، فرائض تھے وہ بھی ختم، نماز کے لیے مسجد کو آنا بند کردیا۔ اس طرح دو چار دن ہوگئے اور وہ نماز کو نہیں آیا، تو محلے کے لوگوں نے سوچا کہ بیمار تو نہیں ہوگیا؟ چلو جا کر دریافت کریں، کچھ لوگ وفد کی شکل میں اس کے گھر پہنچے، خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد پوچھا کہ طبیعت تو اچھی ہے؟ کہا کہ ہاں الحمدللہ! بہت اچھا ہوں۔ لوگوں نے پوچھا کہ پھر نماز کو کیوں نہیں آرہے ہو؟ بہت دن ہوگئے آپ نماز کو نہیں آئے، کیا بات ہے؟ تو کہنے لگا کہ آپ کو خبر ہوئی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے میرے سے خوش ہوکر میرے سے نماز معاف کردی!!! **لا حول ولا قوة إلا باللّٰه !**

دیکھیے شیطان جاہل لوگوں کو کس طرح بہکانے لگتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیطان جہالت سے لوگوں کے اوپر تسلط قائم کرلیتا ہے۔

اللہ نے مجھے بچایا ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کا قصہ

یہ تو جاہلانہ طبیعت کا اثر ونتیجہ ہے، اس کے برخلاف جب علم ہوتا ہے، تو کیا حال ہوتا ہے انسان کا؟ اس کو ایک واقعے سے سمجھیے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ جیسا کہ ہم جانتے ہیں، بہت بڑے عالم تھے، محدث بھی تھے، بہت بڑے صوفی اور بزرگ بھی تھے۔ ان کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ ان کے سامنے ایک اَبر چھا گیا اور اس میں سے چمک ظاہر ہوئی، انھوں نے اس کی طرف دیکھا، تو اس کے اندر سے ایک آواز آنے لگی، آواز کی طرف متوجہ ہوئے، تو اس آواز میں ان سے کہا گیا کہ آپ کی عبادت آپ کا زُہد، ریاضت، آپ کے مجاہدات سے ہم بہت خوش

ہو گئے؛ اس لیے آپ سے نماز معاف کر دی جاتی ہے۔

انھوں نے یہ سنتے ہی سوچا کہ نماز اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے معاف نہیں ہوئی؛ جب کہ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی عبادت و ریاضت کا جو حال تھا، وہ سب کو معلوم ہے، تو میرے سے کیسے معاف ہو سکتی ہے؟ لہٰذا یہ دراصل شیطان کی آواز ہے، پھر" **لاحول ولا قوہ إلا باللّٰه** "پڑھا۔ یہ پڑھنا تھا کہ وہ ابر جو نظر آ رہا تھا اور اس کے اندر سے چمک ظاہر ہو رہی تھی وہ دُھویں کی شکل میں تبدیل ہو کر غائب ہو گئے، حضرت سمجھ گئے کہ دراصل شیطان کی آواز تھی، پھر کچھ دیر بعد اسی طرح ہوا اور اس کے اندر کہا گیا کہ آپ کو آپ کے علم نے بچا لیا۔ حضرت نے فوراً اس کے جواب میں فرمایا کہ میرے علم نے نہیں، میرے خدا نے مجھے بچا لیا۔

دیکھا آپ نے کہ علم انسان کی رہنمائی کرتا ہے؛ لیکن بچانے والی ذات تو اللہ ہی کی ہوتی ہے، اگر خدا بچانا نہ چاہے، تو وہ عالموں کو بھی گمراہ کر دے، جیسے بہت سے ہو جاتے ہیں۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رَحِمَہُ اللہُ کے ساتھ ایک اور واقعہ بھی پیش آیا کہ آپ ایک مرتبہ بڑی شدت سے پیاس محسوس کر رہے تھے، (حضرت نے جنگلات میں کئی سالوں تک زندگی گزاری ہے، ریاضت کے لیے، مجاہدات کے لیے)، تو اس زمانے میں پانی ایک دفعہ نہیں ملا، بڑی شدت کی پیاس لگ رہی تھی، دور دور تک پانی کا نام و نشان نہیں تھا۔ اسی وقت ایک ہاتھ ظاہر ہوا اور اس ہاتھ میں ایک گلاس تھا، جو سونے یا چاندی کا تھا اور اس کے اندر پانی بھی تھا اور آواز آ رہی تھی کہ آپ کے لیے یہ جنت سے بھیجا جا رہا ہے، آپ اس کو لیجیے، استعمال کیجیے۔ حضرت نے سمجھ لیا کہ یہ شیطان کی مکاری ہے؛ لہٰذا" **لاحول ولا قوّة إلا باللّٰه** "پڑھا۔

حضرت کو یہ بات کیسے سمجھ میں آئی کہ یہ شیطان کی مکاری وعیاری ہے؟ یہ بات سمجھ میں آئی شریعت کے علم سے؛ کیوں کہ یہ سونے اور چاندی کا گلاس تھا اور سونے اور چاندی کا استعمال اللہ کے نبی صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی شریعت میں ممنوع ہے، حرام ہے، ناجائز ہے؛ دنیا میں رہتے ہوئے جنت سے وہ چیز دی جائے جو خود شریعت کے اندر حرام ہو، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟

شیطان نے بہکانے کی کوشش کی؛ لیکن حضرت سمجھ گئے ''لاحول ولاقوۃ'' پڑھا، تو شیطان کہنے لگا آپ کے علم نے آپ کو بچالیا۔ حضرت نے فرمایا کہ علم نے نہیں؛ بل کہ میرے خدا نے مجھ کو بچالیا۔ تو اس طرح علم رہنمائی کرتا ہے، جس کی وجہ سے شیطان کے مکر کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

شیطان کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بہکانے کی کوشش

یاد رکھو کہ شیطان کی عیاری ومکاری بڑی خطرناک ہوتی ہے، وہ کسی کو بھی نہیں چھوڑتا، حتیٰ کہ حضراتِ انبیا علیہم السلام کو بھی نہیں چھوڑتا۔

ایک دفعہ شیطان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور آکر کہنے لگا: ''آپ تو وہ ہیں کہ اپنی ربوبیت سے شیر خوارگی میں آپ نے کلام کیا؛ جب کہ کوئی اور ایسا نہیں کرسکتا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ رُبوبیت واُلوہیت تو اس اللہ کے لیے ہے، جس نے مجھے قوتِ گویائی دی۔

پھر وہ کہنے لگا کہ اے وہ ذات! کہ جس نے اپنی اُلوہیت سے مُردوں کو زندہ کیا ہے، اے وہ ذات! جس نے اپنی اُلوہیت سے مختلف پرندوں کو بنا کر زندہ چھوڑا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہنے لگے ''لاحول ولاقوۃ إلا باللّٰہ'' میں کہاں کا خدا، میرے اندر کہاں الوہیت؟ الوہیت تو اس اللہ کے اندر ہے، جو مجھے بھی زندگی اور

موت دیتا ہے۔ (مكائد الشيطان ابن أبي الدنيا: ٧٦)

دراصل شیطان ان باتوں سے ان کو بہکانے کے لیے آیا تھا تاکہ ان کے ذہن میں یہ ڈال دے کہ جیسے لوگ سمجھتے ہیں، اسی طرح یہ اُلوہیت کے حامل ہیں۔ یعنی خدائی صفات ان کے اندر ہیں، تو خدائی صفات کا حامل بتایا اور ان کے ذہن میں یہ بات ڈالنی چاہی تاکہ نعوذ باللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام گمراہ ہو جائیں؛ لیکن اللہ تو انبیائے کرام علیہم الصلوۃ والسلام کی حفاظت کرتا ہے اور اپنی عصمت سے ان کو نوازتا ہے؛ اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فوراً یہ جواب دیا۔

معلوم ہوا کہ شیطان بڑا مکار ہے، عیار ہے، اور اسی لیے وہ چیزوں کو مزین کرتا ہے اور باتوں کو اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ انسان بہک جاتا ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ سے شیطان کا عجیب سوال

حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کا نام کون نہیں جانتا؟ آپ کا واقعہ ہے کہ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ دل میں خیال کیا کہ اگر شیطان سے ملاقات ہو جائے، تو ایک سوال کروں گا اور انھوں نے ایک دن اللہ سے دعا بھی کردی کہ اے اللہ! کبھی شیطان سے ملاقات کرادے، تاکہ اس سے سوال کرلوں۔ ایک دن نماز پڑھ کر مسجد کے باہر نکلے، تو ایک بوڑھا آدمی جھک کر سلام کرنے لگا۔ حضرت جنید رحمہ اللہ نے اس کو دیکھ کر کہا کہ کون ہو تم؟ کہنے لگا کہ میں وہی ہوں، جس سے ملنے کی آپ کو آرزو اور تمنا تھی۔

حضرت سمجھ گئے کہ یہ اصل میں شیطان ہے۔ شیطان نے کہا کہ آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟ حضرت جنید رحمہ اللہ نے کہا کہ میرے ذہن میں تیرے متعلق ایک سوال ہے، سوال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے تجھے حضرت آدم

عَلَیْہِ السَّلَامُ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا، تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تجھے کس چیز نے اللہ کے حکم کی تعمیل سے منع کیا؟ کیوں تو نے سجدہ نہیں کیا، کیا اللہ کی عظمت کو نہیں جانتا تھا؟ ارے تجھے اللہ کی معرفت حاصل تھی، اللہ تعالیٰ کی عظمتوں اور جلالتوں سے تو واقف تھا، اس قدر اللہ کی قربت رکھنے کے باجود، جب اللہ نے تجھے حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کر، تو تو نے آخر کیوں سجدہ نہیں کیا؟

اس پر شیطان کا جواب کیا تھا، وہ سننے کے قابل ہے، اس کے جواب نے کچھ دیر کے لیے حضرت جنید رَحِمَہُ اللّٰہُ کے ہوش اُڑا دیے۔ اس نے کہا کہ جنید! آپ جیسا توحید پرست آدمی اور یہ مشرکانہ سوال؟ آپ جیسا توحید پرست ایک اللہ کو ماننے والا، ایک اللہ کی پوجا کرنے والا اور آپ کے ذہن میں سوال آرہا ہے مشرکانہ سوال کہ میں نے غیر اللہ کو سجدہ کیوں نہیں کیا؟ کہنے لگا کہ آدم تو غیرِ خدا تھے، خدا تو نہیں تھے، میں غیر اللہ کو کیوں سجدہ کرلیتا؟ آپ جیسا توحید پرست آدمی ایسا مشرکانہ سوال میرے سے کررہا ہے، بڑے افسوس کی بات ہے۔

حضرت جنید رَحِمَہُ اللّٰہُ کہتے ہیں کہ جب اس نے یہ بات مجھ سے کہی، تو مجھے لگا کہ ہاں! یہ تو ٹھیک کہہ رہا ہے اور پھر تھوڑی دیر کے لیے مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرا ایمان سلب ہورہا ہے؛ اس لیے میں سناٹے میں پڑ گیا، ہوش وحواس باقی نہ رہے، میں سوچنے لگا کہ اس کو کیا جواب دے سکتا ہوں؛ اس لیے کہ جب وہ کہہ رہا ہے کہ تم ایک اللہ کو ماننے والے ہو اور مجھے پوچھتے ہو کہ آدم کو سجدہ کیوں نہیں کیا؟ حضرت جنید کہتے ہیں کہ میرے ذہن میں جواب نہیں آیا۔ فوراً اللہ کی طرف سے الہام ہوا اور مجھ سے کہا گیا کہ اس سے یہ پوچھو کہ حکم دینے والا کون تھا؟ حکم دینے والا جب خود کہہ رہا ہے کہ فلاں چیز کو سجدہ کرو، تو توحید اسی کا نام ہے کہ اس کی بات کو مان لیا جائے۔ حضرت جنید رَحِمَہُ اللّٰہُ کہتے ہیں کہ اس الہام کے بعد میرا ایمان برقرار ہوا، ورنہ

تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے ایمان میں تزلزل پیدا ہو گیا ہے۔

بھائیو! یہ ہے شیطان کی مکاری اور عیاری، نہ ولیوں کو چھوڑا، نہ غوث وقطب وابدال کو چھوڑا، نہ انبیائے کرام علیہم الصلوۃ والسلام کو چھوڑا۔ غور کرو کہ شیطان باتوں کو اور چیزوں کو کس طرح مزین کرتا ہے اور گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس کا ذرا اندازہ اس واقعے سے آپ کر لیجیے؛ اس لیے کبھی بھی شیطان سے بے فکر نہیں ہونا چاہیے، شیطان کی عیاری اور مکاری سے بسا اوقات انسان بے ایمان بھی ہو جاتا ہے؛ لیکن اسے خبر نہیں رہتی کہ میں بے ایمان ہو گیا ہوں؛ شیطان کفر کو مزین کر دیتا ہے۔

مجھ سے کونسا گناہ ہو گیا؟

بعض لوگوں کی زبان پر کبھی کبھی ایسے الفاظ سنے جاتے ہیں جیسے مثلاً کبھی کوئی مصیبت آ گئی، پریشانی آ گئی، اللہ کی طرف سے بیماری میں مبتلا کر دیا گیا یا کھانے کی، پینے کی اور کسی قسم کی پریشانی پیش آ گئی، تو بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے سے کیا گناہ ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ہم کو یہ مصیبت دے رہا ہے؟ اس جملے پر غور کیجیے! نفسانی کید اور شیطانی مکر پر غور کیجیے کہ اس جملے کے اندر کس قدر نفسانی کید اور شیطانی مکر پوشیدہ ہے؛ گویا کہ اس جملے میں وہ دعویٰ کر رہا ہے کہ میں گناہ نہیں کرتا، میں گناہوں سے بالکل معصوم اور پاک ہوں؛ اس لیے کہتا ہے کہ مجھ سے کون سا گناہ ہو گیا؟ یعنی بالکل نہیں ہوا، قطعاً نہیں ہوا، پھر اللہ تعالیٰ مصیبت میں مجھے کیوں ڈال رہا ہے؟ اس میں دعویٰ ہو گیا اپنے آپ کے پاکباز ہونے کا، جس کا دعویٰ انبیائے کرام علیہم الصلوۃ والسلام نے بھی کبھی نہیں کیا تھا؛ لیکن یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ میرے سے کوئی گناہ نہیں ہوا اور جب گناہ ہی نہ ہونے کا یہ دعوے دار ہو گیا، تو اس کا مطلب

یہ ہوگیا کہ نعوذ باللہ یہ انبیا جیسا معصوم ہوگیا۔

اب بتاؤ کہ اس جملے میں شیطانی مکر پوشیدہ ہے کہ نہیں ہے؟ نفسانی کید پوشیدہ ہے کہ نہیں ہے؟ لیکن یہ جملہ کتنی آسانی وسادگی کے ساتھ زبان سے نکل جاتا ہے، اور کس قدر لوگ اس کے اندر ملوث ہیں؛ لیکن کبھی ان کو دھیان تک نہیں جاتا کہ ہم نے اس جملے کے اندر کتنا بڑا دعویٰ کیا ہے، اس دعوے کی وجہ سے ان کی ساری عبادت بھی رائیگاں چلی جاتی ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام اور شیطان کی خطاؤں میں فرق

یہاں ایک نکتہ عرض کرتا ہوں، وہ یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام سے بھی خطا ہوئی اور شیطان نے بھی خدا کی نافرمانی کی؛ مگر ان دونوں کی نافرمانیوں میں ایک زبردست اور بڑا عظیم فرق ہے، وہ یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام سے جب ایک خطا کا صدور ہوا، تو فوراً اللہ تعالیٰ کے سامنے انھوں نے اپنے گناہ کا اعتراف کرلیا اور شیطان سے جب گناہ ہوا، تو وہ اَڑ گیا کہ مجھ سے گناہ نہیں ہوا ہے؛ بل کہ میں نے تو آدم کو سجدہ نہ کر کے توحید کا مظاہرہ کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ بندے کا اللہ کی جناب میں عجز و نیاز اور اپنی خطاؤں و گناہوں کا اعتراف ہی اس کو اللہ کے یہاں مقام دلاتا ہے؛ اس لیے یوں کہنا ''میں نے کونسا گناہ کیا'' یہ بہت نازیبا بات ہے اور اس میں دعویٰ ہے؛ لہٰذا ایسے قبیح جملوں کے استعمال کرنے سے بچنا چاہیے، شیطان ایسے جملے ہماری زبانوں سے نکلوا کر ہمارا ایمان برباد کرنا چاہتا ہے۔

''عبادات پر ناز'' - ایک عظیم شیطانی حربہ

شیطانی حربوں کا ذکر چل رہا ہے، تو ایک اور اہم بات کی طرف توجہ کیجیے! خاص

طور پر میں سالکین کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں: وہ یہ ہے کہ شیطان انسانوں کو گمراہ کرنے ایک حربہ یہ بھی استعمال کرتا ہے، جو زیادہ خطرناک اور قابلِ توجہ ہے، وہ کیا؟ وہ یہ کہ بسا اوقات شیطان عبادات وریاضات کے ذریعے، نماز روزے کے ذریعے، وظائف کے ذریعے انسان کو بہکاتا ہے اور دل میں یہ بات ڈالتا ہے کہ تو بڑا عابد و بزرگ ہو گیا ہے، تیرا بہت اونچا مقام ہے، اس طرح عبادات پر ناز وفخر میں مبتلا کر کے انسان کو خدا کی نظروں سے گرا دیتا ہے۔

بعض لوگ ہوتے ہیں کہ دو چار رکعات پڑھ کر ڈینگیں مارنے لگتے ہیں اور خود کو سب سے افضل اور دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں؛ یہ عبادات وریاضات پر ناز وفخر دل کی نجاستوں وگندگیوں میں سے ایک ہے۔ معلوم نہیں کتنی گندگیاں ایسی ہمارے اندر ہیں، کتنی خباثتیں اور رذائل ہمارے اندر جمی ہوئی ہیں اور ہم اس کے باوجود بڑے مطمئن ہیں کہ ہم تو ماشاء اللہ ذاکر ہیں، شاکر ہیں، سالک ہیں اور فلاں اور فلاں قسم کی عبادتوں میں لگے ہوئے ہیں؛ حالاں کہ یہ عبادت نہیں؛ بل کہ عبادت کے لباس میں گناہ ہیں، جن کو شیطان نے اس طرح مزین کر دیا ہے اور نیکی کا پردہ ڈال دیا ہے کہ اس کے اصلی چہرے کو دیکھنے اور اس کی اصلیت کو پہچاننے سے ہماری آنکھیں قاصر ہیں۔

اسی لیے شیخ کی ضرورت پڑتی ہے کہ وہ شیطان کے مکروفریب سے واقف ہوتا ہے، نیکی اور بدی کی پہچان رکھتا ہے، وہ شیطان کی چالوں کو سمجھتا ہے، وہ بتاتا ہے کہ شیطان کہاں چکما دے رہا ہے، کس طرح گمراہ کر رہا ہے؛ اسی لیے ہمارے بزرگانِ دین فرماتے ہیں کہ کسی اللہ والے سے تعلق رکھنا اور اس کی رہبری میں دین پر چلنا ضروری ہے، ورنہ شیطان ایسا مکار اور چالباز ہے کہ اس نے نہ ولیوں کو چھوڑا، نہ غوث وقطب کو چھوڑا، نہ انبیائے کرام علیہم الصلوۃ والسلام کو چھوڑا، نہ کسی اور کو چھوڑا، تو ہمارے اور آپ کے ساتھ اس کا کیا معاملہ ہوتا ہوگا؟!!

شیطان کا اللہ کے سامنے دعویٰ

بھائیو! ہم سب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے، قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:﴿اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ﴾(بے شک شیطان کھلا دشمن ہے) (القصص:۱۵)

اور ایک جگہ قرآنِ کریم کے اندر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ شیطان نے اللہ کے سامنے اس بات کا دعویٰ کیا کہ وہ انسانوں کو ہر طریقے سے اور ہر طرف سے گمراہ کرنے کی کوشش کرے گا؛ اللہ تعالیٰ شیطان کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ

﴿قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ﴾ (الأعراف:۱۶)

(اے اللہ! آپ نے چوں کہ مجھے گمراہ کیا؛ اس لیے میں لوگوں کو بہکانے تیرے سیدھے راستے پر بیٹھوں گا؛ پھر میں ان کے سامنے سے، پیچھے سے، ان کے داہنی طرف سے اور بائیں طرف سے بہکانے آؤں گا؛ پھر آپ ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہیں پائیں گے)

ان آیتوں میں شیطان کے اُسی دعوے کا ذکر کیا گیا ہے، شیطان کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں اور یہ بات بھی کہ اس نے اتنا بڑا یہ دعویٰ خود اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہو کر کیا تھا۔ شیطان کہتا ہے کہ اے اللہ! چوں کہ آپ نے مجھے گمراہ قرار دیا ہے؛ اس لیے میں صراطِ مستقیم پر آکر میں بیٹھوں گا؛ تاکہ میں ان کو گمراہ کرتا رہوں، دائیں سے بائیں سے، آگے سے پیچھے سے چہار طرف سے آکر ان کو بہکانے کی کوشش کروں گا؛ تو وہ اپنے اس دعوے کو حقیقت بنانے کیا کچھ نہ کرتا

ہوگا اور اس کے لیے کس قدر قوت وطاقت سے اور اپنی عقل و تجربے سے کام لیتا ہوگا؟ اس کا اندازہ کرنا کوئی مشکل نہیں۔

شیطان صرف چار طرف سے بہکاتا ہے۔ کیوں؟

یہاں اس آیت میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ شیطان نے بہکانے کے لیے صرف چار طرفوں کا ذکر کیا ہے: آگے، پیچھے، داہنے اور بائیں کا؛ جب کہ جہات چھ ہیں، ان میں اوپر اور نیچے کا ذکر شیطان نے نہیں کیا، کیوں؟

اس کی وجہ علما لکھتے ہیں کہ شیطان نے نیچے کی جہت کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ وہ نیچے سے آنا نہیں چاہتا؛ کیوں کہ اس کے اندر کا تکبر اسے نیچے سے آنے میں مانع بنتا ہے؛ اس لیے کہ نیچے سے آنے میں جھکنا پڑتا ہے اور جس میں تکبر ہوتا ہے، وہ کبھی جھکنے کو گوارہ نہیں کرتا اور اس نے اوپر کی جہت کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ شیطان کو اوپر سے آنے کی اللہ نے قدرت نہیں دی ہے؛ اس لیے کہ اوپر سے فرشتوں کے آنے کا مقام ہے، اللہ تعالیٰ نے اس راہ کو شیطان کے لیے مسدود کر دیا ہے۔

شیطان صراطِ مستقیم پر؟ ایک عجیب نکتہ

اب اس آیت کے مضمون پر غور کرو کہ شیطان نے یہ کہا کہ میں صراطِ مستقیم پر بیٹھوں گا "لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ" سوال یہ ہے کہ کیا شیطان بھی صراطِ مستقیم پر بیٹھتا ہے؟ جی ہاں! بیٹھتا ہے، مگر ایک ہے صراطِ مستقیم پر قائم ہونا کھڑا ہونا اور ایک ہے صراطِ مستقیم پر بیٹھنا، دونوں میں بڑا فرق ہے، ہر مسلمان، نیک آدمی، اللہ والا صراطِ مستقیم پر کھڑا ہوتا ہے اور محاورے میں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ صراطِ مستقیم پر چلنے کی غرض سے وہ اس پر کھڑا ہے اور چل رہا ہے؛ لیکن صراطِ

مستقیم پر بیٹھنا الگ چیز ہے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ چلنے کے لیے نہیں، اس کو پار کرنے کے لیے نہیں؛ بل کہ کسی بُری غرض ونیت سے اس پر ہی بیٹھ گیا ہے۔ جیسے ڈاکو لوگ شاہ راہوں (MAIN ROAD) پر بیٹھ جاتے ہیں اور گزرنے والے قافلوں کو لوٹ لیتے ہیں، بالکل شیطان کا صراطِ مستقیم پر بیٹھنا بھی اسی طرح کا بیٹھنا ہے کہ وہ اس پر بیٹھ کر لوگوں کے ایمانوں اور نیکیوں کو لوٹ لینا چاہتا ہے۔

یہیں سے ایک نکتے کی بات بھی سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ کہ شیطان لوگوں کو بہکانے کے لیے صراطِ مستقیم پر آتا ہے، یعنی ان لوگوں کے پاس آتا ہے، جو صراطِ مستقیم پر چل رہے ہیں، اسے تو انہیں کو بہکانا ہے اور وہ لوگ جو پہلے ہی سے بہکے ہوئے اور گمراہ ہیں، ان کو بہکانے کی اسے ضرورت کیا ہے؟ وہ تو بہکے ہوئے ہیں؛ لہٰذا صراطِ مستقیم پر آکر بہکانے کا حاصل یہ ہوا کہ وہ صراطِ مستقیم پر چلنے والوں کی تلاش وجستجو میں وہاں آتا اور وہاں بیٹھ کر ان کو بہکاتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اگر وہ کفر و معصیت اور جہالت و بغاوت کے راستے پر جا کر بیٹھے گا، تو اس کو بہکانے کے لیے کون ملے گا؟ وہاں تو کافر ہوں گے، شرابی ہوں گے، زانی ہوں گے، لٹیرے ہوں گے، یہ سب لوگ پہلے سے بھٹکے و بہکے ہوئے ہیں، شیطان اتنا بے وقوف نہیں کہ وہ اپنی محنت ان کے پیچھے ضائع کردے؛ لہٰذا وہ صراطِ مستقیم پر آتا ہے کہ یہیں اس کو مومنین ملتے ہیں، مسلمین ملتے ہیں، ذاکرین ملتے ہیں، نمازی ملتے ہیں، حاجی ملتے ہیں، اللہ والے ملتے ہیں۔

ایک عالم کا قصہ

مجھے ایک عالم کا قصہ یاد آیا کہ ان سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت! ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ اہلِ سنت میں سے ہوتے ہیں اور وہ بہک جاتے اور شیعہ فرقے

میں داخل ہوجاتے ہیں، کوئی قادیانی بن جاتا ہے، کوئی اور کسی گمراہ فرقوں ولوگوں میں داخل وشامل ہوجاتا ہے؛ مگر ہم نے کبھی نہیں سنا کہ ان گمراہ فرقوں کے لوگ مسلمان ہوگئے اور اہلِ سنت میں داخل ہوگئے، اس کی کیا وجہ ہے؟ تو ان عالم نے بڑا عمدہ جواب دیا، انھوں نے کہا کہ دیکھو! شیطان ان ہی لوگوں کو بہکاتا ہے اور ان ہی کے دلوں میں وسوسہ وشبہات ڈالتا ہے، جو حق پر ہوتے ہیں اور جو پہلے ہی سے بہکے ہوئے ہوں، ان کو شیطان ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے؛ لہٰذا بہکاوا اگر ہوگا، تو اہلِ سنت ہی کو ہوگا، نہ کہ اہلِ باطل کو۔ اس لیے شیطان اہلِ حق کو بہکاتا ہے اور ان ہی میں سے کچھ لوگ بہک جاتے ہیں۔

سالکین کو شیطان کس طرح بہکاتا ہے؟

اب آیئے اصل بات کی طرف؛ علما نے بیان کیا ہے کہ صراطِ مستقیم پر بیٹھنے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ شیطان نیکیوں کے ذریعے بھی انسانوں کو تباہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ اس طرح پر کہ جب نیک لوگ نیکی کرتے ہیں، تو ان کے دل ودماغ کے اندر ان کی بڑائی کا تصور ڈال دیتا ہے اور وہ نیکی کے کام کرکے اپنے کو بڑا سمجھتے اور ناز وفخر میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔

ایک دفعہ حضرت سیدنا موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَامُ کے پاس شیطان پہنچا، حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَامُ نے اسے دیکھا، تو فرمایا ”کیا تو شیطان نہیں ہے؟“ اس نے کہا کہ ہاں! میں شیطان ہوں۔ حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَامُ نے کہا کہ مجھے یہ بتا کہ تو اب تک لوگوں کو گمراہ کرتا آیا ہے، گمراہ کرنے کے لیے سب سے بڑا کونسا حربہ اختیار کرتا ہے؟ اس نے کہا کہ میں اس طرح گمراہ کرتا ہوں کہ انسان کو اس کی نیکیوں پر تفاخر میں مبتلا کردیتا ہوں، نیکی کرتا ہے، تو سمجھتا ہے کہ میں بہت بڑا آدمی ہوگیا ہوں، میں

نے تو بہت کچھ کر دیا ہے، اپنی نیکیوں کو اچھا سمجھنا، اپنے آپ کو اچھا سمجھنا، اپنی عبادت، ریاضت ومجاہدے کو قابلِ فخر چیز سمجھنا، اپنے آپ کو اونچا اور سب سے اعلیٰ سمجھنا، یہ عُجب وتکبر ہے۔ اس عُجب وتکبر کے راستے سے میں ان کو بہکایا کرتا ہوں۔

(تنبیه الغافلین)

معلوم ہوا کہ یہ بھی ایک حربہ ہے شیطان کا اور بہت بڑا حربہ ہے۔ چناں چہ بہت سارے لوگ عبادت کرتے ہیں، ریاضت کرتے ہیں، مجاہدات کرتے ہیں، علم کے میدان میں آگے بڑھتے ہیں اور مختلف قسم کی خدمات کرتے رہتے ہیں، اللہ کے دین کی اشاعت میں، اللہ کے دین کی دعوت میں، اللہ کے دین کو پھیلانے میں لگتے ہیں اور اسی کے ساتھ اس تکبر غرور اور فخر میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ”ہم چوں ماڈنگرے نیست“ ہم تو بہت آگے بڑھ گئے ہیں، اب ہمارا کوئی مقابل نہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ پھر دوسروں کی توہین اور تذلیل اور دوسروں کے بارے میں بدگمانی، دوسروں کے بارے میں ایک قسم کے بُرے خیالات بھی دل میں جما لیتے ہیں، جس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ آدمی جتنا عبادت کرتا ہے اتنا نیچے آجاتا ہے، اس سے اللہ کی نظر میں وہ انتہائی ناقص ہو جاتا ہے اور آخری منزل میں اس کو گرا کے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

ایک بزرگ کی قیمتی نصیحت

اس لیے سالک کو ہمیشہ اپنے آپ کو حقیر سمجھنا چاہیے، اسی عاجزی وانکساری سے ترقی ہوتی ہے۔ ایک بزرگ کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے کہا کہ حضرت کوئی نصیحت فرمایئے! انھوں نے ایک دومنٹ سوچنے کے بعد کہا کہ بھائی! کبھی پہاڑ پر چڑھے ہو، اس نے سوچا، اس کے بعد کہا کہ ہاں چڑھا ہوں، فرمایا کہ جب پہاڑ پر چڑھے تھے، تو کس طرح چڑھے تھے؟ جھک کر چڑھے تھے یا اکڑ کے، اس

نے کہا کہ جب چڑھنے کا موقع آیا، تو جھک کے چڑھا تھا۔

آپ بھی سوچ کر دیکھ لیجیے کہ جب پہاڑ یا کسی بھی بلندی پر چڑھنے کا موقع آتا ہے تو انسان کیسا چڑھتا ہے؟ جھک جاتا ہے، جھک کر اوپر چڑھتا ہے۔ اس نے کہا کہ حضرت چڑھنے کے لیے جھک کر چڑھتا رہا، فرمایا کہ اچھا، جب چڑھے تھے، تو اترے بھی ہوں گے، اترے تو کس طرح اُترے تھے، جھک کر یا اکڑ کر؟ اس نے کہا کہ اکڑ کے اترا تھا۔

اس لیے کہ اگر جھک کے اتریں گے تو لڑھک کر نیچے آجائیں گے، اوپر سے نیچے کی طرف آتے وقت جھکنا نہیں چاہیے؛ بل کہ اکڑ کے آنا چاہیے، اس نے کہا کہ حضرت اکڑ کے آیا تھا۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ اس کے اندر بڑی عبرت ہے، وہ یہ کہ جو جھکتا ہے، اللہ اسے بلندی پر لے جاتا ہے، جو اکڑتا ہے، اسے اوپر سے نیچے لاتا ہے۔

کیسی اچھی مثال دی ہے، کیا بہترین نصیحت فرمائی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ جھکنا اللہ کو پسند ہے، اگر ظاہری طور پر بھی آپ کسی بلندی پر پہنچنا چاہتے ہیں، حسی طور پر بھی کسی بلندی پر پہنچنا چاہتے ہیں، تو وہاں بھی جھکنا ضروری ہو جاتا ہے اور جب آدمی اکڑتا ہے، تو اوپر سے نیچے کی طرف آجاتا ہے۔

اسی طریقے پر روحانی و باطنی طور پر جو بلندیوں پر پہنچنا چاہتا ہے، تو اسے بھی جھکنا پڑتا ہے، جھکے گا، چڑھے گا، اکڑے گا، تو نیچے آکر مرے گا، یا نہیں تو کم از کم گرے گا؛ اس لیے یہ فرمایا گیا ہے کہ شیطان کا ایک راستہ یہ بھی ہے کہ عبادت، ریاضت، مجاہدہ، نیکی، دینی خدمات یہ سب کچھ کرنے کے ساتھ ساتھ انسان کو اس طرح کے خیالات میں مبتلا کرتا ہے، جس کی وجہ سے وہ اللہ کی نگاہ میں گر جاتا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کا شیطان سے ایک سوال

بہ ہر حال! شیطان کے مختلف حربے ہیں، جن سے وہ بہکا تا ہے، یہاں یاد آیا کہ حضرت سیدنا نوح علیہ السلام طوفان کے موقعے پر جب سفینے میں سوار تھے، تو وہاں پر اچانک ان کو شیطان نظر آیا، انھوں نے کہا کہ تو یہاں بھی پہنچ گیا؟ اب میں تجھے نہیں چھوڑوں گا، جب تک کہ تیرا راز نہ معلوم کرلوں۔ اس کو حضرت نوح علیہ السلام نے پکڑ لیا اور فرمایا کہ تیرا راز مجھ کو بتا کہ تو گمراہ جو کرتا ہے، وہ کس راستے سے کرتا ہے؟

تو اس نے کہا کہ پانچ باتیں ہیں؛ لیکن پانچ میں سے میں آپ کو تین بتاتا ہوں، دو نہیں بتاتا۔ حضرت نوح علیہ السلام کو اللہ کی طرف سے وحی آئی کہ اس مردود سے کہو کہ ہمیں ان تین کی ضرورت نہیں ہے، وہ دو ہی ہم کو بتادے؛ اس لیے کہ اصل تو وہی ہے راز۔ تو حضرت سیدنا نوح علیہ السلام نے کہا کہ مجھے ان تین حربوں کی ضرورت نہیں ہے، وہ دو بتا، جو تو نہیں بتانا چاہتا۔ تو اب مجبور ہو گیا اور کہنے لگا کہ وہ دو باتیں، جس سے میں لوگوں کو گمراہ کرتا ہوں اور آپ کو بتانا نہیں چاہتا تھا، وہ آپ سن لیجیے! ایک ''حسد'' اور ایک ''حرص''؛ پھر شیطان کہنے لگا کہ حسد سے میں گرا اور حرص سے حضرت آدم گر گئے۔

اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو بنایا اور ان کو علم عطا فرمایا اور ان کی شان و شوکت کو فرشتوں کے سامنے ظاہر فرمایا، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ تو فرشتے تو سجدے میں گر گئے، ابلیس کو تکبر نے روکا، تکبر کے بعد حسد پیدا ہوا، حسد اس لیے پیدا ہوا کہ ان کی وجہ سے میں اللہ کی نگاہ میں گر گیا ہوں، اب کسی نہ کسی طرح ان کو بھی گرانا ہے، یہ ہے حسد۔ جب کسی کے پاس کوئی کمال دیکھے، جب کسی کے پاس حُسن و جمال دیکھے، جب کسی کا عطا و نوال دیکھے،

جب کسی کے اندر بڑائی دیکھے، جب کسی کے اندر علم دیکھے، جب کسی کے اندر مال ودولت کی فراوانی دیکھے، اس وقت دل کے اندر یہ خواہش کا ہونا کہ اس سے ساری چیزیں چھن جائیں، چاہے مجھے ملیں کہ نہ ملیں، اس کے پاس بھی نہ رہیں، یہ ہے حسد کی بیماری، یہ حسد اللہ کی نگاہ میں بہت بُری چیز ہے۔

شیطان نے سوچا کہ اللہ نے اُن کو اتنا اونچا بنایا ہے، ان کو بھی گراؤں گا، میں جیسے گر گیا ان کو بھی گراؤں گا، اس کے بعد اس حسد میں مبتلا ہو کر وہ فکر میں رہا کہ کس طرح ان کو میں ذلیل وخوار کرنے میں کامیاب ہو جاؤں؟ یہ ہے حسد جس کی وجہ سے شیطان گمراہ ہوا۔

اور حضرت آدم علیہ السلام کو جس درخت سے منع کیا گیا تھا، جا کر اس کو کھالیا تھا، اس لیے کہ شیطان نے قسم کھا کھا کر ان سے کہا تھا کہ میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ اس درخت کو کھانے کا اتنا بڑا فائدہ ہے اور فائدہ یہ ہے کہ آپ اس کو کھالیں گے، تو کبھی نہیں مریں گے، ہمیشہ زندہ رہیں گے، انھوں نے کہا کہ بہت اچھا، کھالیں گے، تو حرص میں آکر کھا گئے، اس کو شیطان نے کہا کہ حسد نے مجھے تباہ کیا اور حرص کی بیماری نے حضرت آدم علیہ السلام کو گرا کر رکھ دیا۔

عبرت وموعظت

میرے بھائیو اور دوستو! شیطان کے یہ سارے راز ہم کو اللہ کے کلام کے ذریعے ملے، انبیائے کرام سے ملے، بزرگوں کے کلام کے ذریعے ہم کو ملے، ان ساری چیزوں سے ہم کو معلوم ہوا کہ شیطان کس کس طریقے پر انسان کو بہکاتا ہے، اور ہمیں گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر اللہ سے دُوری میں مبتلا کرتا ہے، جب ہمیں یہ سب چیزیں معلوم ہوگئیں، تو اب ہم ان ساری چیزوں سے بچنے کے لیے

اپنے آپ کو چوکنا رکھیں۔

قرآنِ کریم نے ہم کو بتادیا ہے ﴿اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِیْنٌ﴾ (شیطان کھلا ہوا دشمن ہے) (القصص:۱۵)

اگر کوئی آپ کا باپ یا استاذ، یا آپ کا دوست، آپ کو بتادے کہ فلاں آدمی سے چوکنا رہو؛ اس لیے کہ وہ تمھارا دشمن ہے، تو آپ کو یقین آتا ہے اور آپ بچتے ہیں کہ نہیں بچتے؟ باپ کی بات پر یقین، استاذ کی بات پر یقین، شیخ کی بات پر یقین، دوست کی بات پر یقین؛ لیکن اللہ کہہ رہا ہے کہ شیطان ہمارا کھلا دشمن ہے؛ مگر افسوس کہ اس پر یقین نہیں اور وہ چیزیں، جو شیطان ہم کو گمراہی میں پھنسانے کے لیے اختیار کرتا ہے، ان چیزوں کو بڑی آسانی سے ہم اختیار کرتے چلے جاتے ہیں، بہت بڑی ہمارے لیے عبرت کی بات ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مکائدِ شیطان کو سمجھنے کی ہمیں توفیق دے اور اس سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ ہمیں بھرپور توفیق وہمت عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد للّٰه رب العالمين

اللہ تعالیٰ ہی
کو مقصود
بنائیے!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ تعالیٰ ہی کو مقصود بنائیے!

اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم ، بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿فَاِذَافَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ﴾ (الإنشراح:۷-۸)

حضرات! آپ کے سامنے قرآنِ کریم کی ایک مشہور سورت کی آخری آیتیں تلاوت کی گئی ہیں، جس کو ”سورۂ الم نشرح“ یا ”سورة الإنشراح“ کہا جاتا ہے اور ان آیات میں ایک نہایت اہم مضمون ارشاد فرمایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَاِذَافَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ﴾

(اے ہمارے نبی! جب آپ فارغ ہو جائیں، تو محنت کیجیے اور اپنے رب ہی کی طرف رغبت کیجیے)

اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرکے فرمایا گیا ہے کہ اے نبی! آپ فارغ ہو جائیں، کس کام سے؟ اپنے دعوتی اور تبلیغی اور علمی و اصلاحی، جہادی اور مختلف قسم کے جو کام آپ کے سپرد ہیں، ان سے فارغ ہو جائیں، تو پھر عبادت کے لیے تیار ہو جایئے اور اس میں خوب محنت کیجیے اور پھر اپنے ہی رب کی طرف پورے پورے طور پر متوجہ ہو جایئے۔

یہ آیتیں بڑی قابلِ غور آیتیں ہیں، اگرچہ خطاب ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو؛ لیکن آپ کے واسطے سے تمام لوگوں کو ہے اور بالخصوص امتیوں کو اور پھر بالاخص

سالکین کو، جو اللہ کے راستے میں چلنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔

زیرِ بحث آیت کی تفسیر

اب آیئے ان آیات کے معنے پر غور کریں! اس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَاِذَافَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ﴾ (اے ہمارے نبی! جب آپ فارغ ہوجائیں، تو محنت کیجیے اور اپنے رب ہی کی طرف رغبت کیجیے)

اس میں جو یہ فرمایا ''جب آپ فارغ ہوجائیں'' اس سے مراد یہ ہے کہ جب آپ اپنے دنیوی امور سے اور اپنی دینی و نبوی ذمہ داریوں سے فارغ ہوجائیں، '' فَانْصَبْ ''تو آپ عبادت میں اپنے کو لگا دیجیے؛ چناں چہ مفسرین کرام نے فارغ ہونے کے معنے میں دنیوی امور و دینی امور دونوں کو مراد لیا ہے؛ اسی لیے بعض نے فرمایا کہ ''جب آپ دنیوی کاموں سے فارغ ہوجائیں''، بعض نے کہا کہ ''جب آپ جہاد سے فارغ ہوجائیں'' اور بعض نے کہا کہ ''جب آپ تبلیغِ وحی سے فارغ ہوجائیں''۔ (دیکھو: تفسیر ابن کثیر و روح المعانی)

لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ آپ جب اپنے دنیوی و دینی کاموں و ذمہ داریوں سے فارغ ہوجائیں، تو اب آپ خالص اللہ کی عبادت میں اپنے کو لگا دیجیے، اب کوئی اور مشغولیت نہ ہو، کسی کی جانب دھیان نہ ہو؛ بل کہ صرف اور صرف عبادتِ الٰہی میں مصروف ہوجائیں۔ اور '' وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ'' (اپنے رب ہی کی جانب رغبت کیجیے) کیا مطلب؟ مطلب یہ کہ اب آپ کو کسی اور کام سے کوئی مطلب نہ ہو، حتیٰ کہ دعوت و تبلیغ، تعلیم و تفہیم وغیرہ سے بھی کوئی مطلب نہ ہو؛ بل کہ صرف اپنے رب کی جانب توجہ و رغبت کیجیے۔

بلاغت کا ایک قاعدہ

اس آیت میں ایک بات طالبِ علموں کو سمجھنے کی ہے، یہاں طلبہ بھی موجود ہیں وہ غور کریں، وہ یہ کہ عربی میں اصل یہ ہے کہ پہلے فعل آتا ہے، پھر فاعل و مفعول آتے ہیں، پھر اس فعل کے متعلقات آتے ہیں، جیسے ہم کہتے ہیں: " **تَکَلَّمَ زَیْدٌ خَالِداً فِيْ التَّارِیْخ** "(زید نے خالد سے تاریخ کے بارے میں گفتگو کی) اس میں دیکھو پہلے" **تکلّم** "ہے جو کہ فعل ہے، پھر "**زید** "جو کہ فاعل ہے، اس کے بعد "**خالد**" آیا ہے، وہ مفعول ہے، اس کے بعد" **في التاریخ**"ہے، جو اس فعل کا متعلق ہے؛ لیکن کبھی کسی مصلحت سے ایسا بھی ہوتا ہے کہ متعلقاتِ فعل کو پہلے اور فعل کو بعد میں لاتے ہیں، جیسا کہ اس آیت میں ہے: " **وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَب**" اس میں "**فارغب**" فعل ہے اور" **إلٰی ربک**" اس فعل کا متعلق ہے؛ اس لیے اصل تو یوں کہا جاتا کہ "**فَارْغَب اِلٰی رَبِّکَ** "لیکن اس میں فعل کو بعد میں اور اس کے متعلق کو پہلے لائے، اس میں ایک مصلحت ہے، وہ یہ ہے کہ اس سے کلام میں حصر (تاکید) پیدا کرنا مقصود ہے؛ لہٰذا اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ " آپ اپنے رب ہی کی جانب رغبت کیجیے اور کسی دوسری طرف رغبت نہ کیجیے"۔ اس بات کے پیدا کرنے کے لیے یہ تقدیم و تاخیر کی گئی۔ یہ بھی ایک قاعدہ ہے عربی زبان کا، بلاغت کا، جس کو علمائے عربیت و بلاغت یوں تعبیر کرتے ہیں: " **تقدیم ماحقه التأخیر یفید الحصر**" (اس چیز کو مقدم کرنا، جس کا حق مؤخر ہونے کا ہے، یہ حصر کا فائدہ دیتا ہے) لہٰذا اس آیت سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ اللہ تعالیٰ کو مطلوب یہ ہے کہ آدمی اپنے تمام دنیوی و دینی کاموں سے جلد سے جلد فارغ ہو اور صرف و صرف اللہ کی جانب متوجہ ہو، اسی کی عبادت میں لگ جائے اور اس وقت کسی اور چیز

کی جانب اس کی توجہ و رغبت نہ ہو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس کو واضح فرمادیا ہے کہ مسلمان کی شان کیا ہونی چاہیے، دعوت و تبلیغ والوں کی شان کیا ہونی چاہیے، درس و تدریس والوں کی شان کیا ہونی چاہیے، محققین اور فقہا کی شان کیا ہونی چاہیے اور مجتہدین کی شان کیا ہونی چاہیے؟!!!

ایک علمی نکتہ

اس آیت میں غور کرنے سے ایک نکتہ یہ بھی سمجھ میں آئے گا کہ آپ کا کوئی کام دنیوی نہیں ہوتا تھا، آپ کی ساری مصروفیات دینی ہوتی تھیں، آپ کی صبح بھی دینی، شام بھی دینی، چلنا پھرنا، کہیں آنا جانا، سفر کرنا سب دینی کاموں کے لیے ہوتا تھا، پھر بھی اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کو یہ حکم دیا کہ آپ اپنے ان دینی کاموں سے جو کہ عباداتِ غیر مقصودہ کی قبیل سے ہیں، جلدی فارغ ہو کر اللہ ہی کی طرف رغبت کیجیے اور عباداتِ مقصودہ یعنی نماز، ذکر وغیرہ میں لگ جائیے۔

جب دینی کاموں ہی سے جلدی فارغ ہو کر عباداتِ مقصودہ میں لگنے کا حکم ہے، تو آپ اندازہ کر لیجیے کہ جو لوگ دنیوی کاموں میں لگے ہوئے ہیں، تو ان کے بارے میں کیا حکم ہوگا؟ ارے بھائی! جو دینی چیزیں ہیں، انہی میں نہیں، جیسے تدریس ہے، تالیف ہے، تصنیف ہے، تحقیق ہے، مطالعہ ہے،، دعوت ہے، تبلیغ ہے، جب انہیں چیزوں میں مگن نہیں رہنا ہے، تو اب سوچ لیجیے، جو دین سے تعلق رکھنے والی ہی نہیں ہیں، وہ محض دنیا ہے، ان کے اندر کیسے دماغ لگایا جا سکتا ہے۔

دنیوی چیزیں تین قسم کی ہیں

اب یہ سمجھیے کہ اس کے اندر جو مضمون آیا ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ کو مقصود بنا کر

زندگی گذاری جائے ، دنیا میں بہت سی چیزیں ہیں، بہت سے حالات ہیں، بہت سے مسائل ہیں، بہت سی ضرورتیں ہیں، بہت سی حاجتیں ہیں؛ لیکن ان سب میں مقصودِ اعظم انسان کے لیے اللہ کی ذات ہے، باقی سب چیزیں ضمنی ہیں۔ یاد رکھیے! کہ دنیا میں چیزیں تین قسم کی ہوتی ہیں: ایک وہ چیزیں، جو اللہ کو پانے کے راستے میں کام آنے والی اور مفید و معین ہیں، جیسے تعلیم ہے، تعلم ہے؛ پھر اس سے آگے بڑھیں، تو تدریس اور وعظ ہے، نصیحت ہے، دعوت و تبلیغ ہے۔

دوسرے: وہ چیزیں جو اللہ کے راستے میں حارج (حرج پیدا کرنے والی) اور مانع (رکاوٹ ڈالنے والی) بننے والی اور اس کے لیے مضر و نقصان دہ ہیں، جیسے گناہ کے کام۔

تیسری: وہ چیز ہیں، جو اس میں نہ مفید و معین ہیں اور نہ مانع و حارج ، جیسے انسان بہت سارے کام کرتا ہے اور اسے کرنے کی ضرورت بھی ہوتی ہے، کھانے کی ضرورت ہے، پینے کی ضرورت ہے، کمانے کی ضرورت ہے اور بیوی بچوں کے ساتھ رہنے کی ضرورت ہے اور مختلف لوگوں سے سابقہ پڑتا رہتا ہے ، تعلقات وابستہ کرنا پڑتا ہے اور رشتہ داریوں کو نباہنا پڑتا ہے، دوستوں کے ساتھ بھی اٹھنا اور بیٹھنا پڑتا ہے، تو ان میں سے جو چیزیں کہ اس راستے میں مانع بننے والی ہیں، حارج بننے والی ہیں، ان سے دور رہنے کا حکم دیا گیا ہے؛ کیوں کہ ان کاموں سے اللہ نہیں ملے گا اور جو چیزیں ایسی ہیں کہ مانع بھی نہیں اور حارج بھی نہیں وہ فضول اور بے کار ہیں، ان کو اپنی دنیوی ضرورت کے لیے اختیار کرے، تو ٹھیک ہے اور جو چیزیں اللہ کے راستے میں مفید ہیں، معین ہیں، مددگار ہیں، ان کو اختیار کرنے کا حکم ہے۔ لیکن ان میں بھی اس بات کا خیال و دھیان چاہیے کہ اصل مقصود اللہ کی ذات

ہے اور یہ دیگر چیزیں اگر چہ کہ اللہ کے راستے میں مفید و معین ہیں، مگر ان کا درجہ ثانوی درجہ ہے، ان کو اولین درجہ دینا صحیح نہیں ہے۔

حضرت نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی ذمہ داریاں

دیکھیے! حضرت نبی اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ پر بہت ساری دینی و نبوی ذمہ داریاں تھیں: دعوت الی اللہ کی ذمہ داری، تبلیغِ احکام کی ذمہ داری، لوگوں کو سمجھانے وافہام وتفہیم کی ذمہ داری، قرآن پڑھانے کی ذمہ داری، جہاد کی ذمہ داری، تعلیم کی ذمہ داری، اصلاحِ احوال کی ذمہ داری وغیرہ۔ ان میں بھی سب سے اہم ذمہ داری، جس کے لیے نبوت دے کر نبی کو دنیا میں بھیجا جاتا ہے، وہ ہے دعوت الی اللہ، لوگوں کو اللہ کا پیغام کو پہنچانا؛ یہ سب سے اہم ذمہ داری ہوتی ہے نبی کی اور یہ بالکل واضح و ظاہر ہے کہ یہ سب اعمال دراصل اللہ کی جانب سے آپ پر عائد تھیں اور ان کو ادا کرنے پر ضرور بالضرور قربِ خداوندی بھی نصیب ہوتا ہے، مگر ان تمام ذمہ داریوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے آپ سے کہا ہے کہ اے نبی! جب آپ ان کاموں سے، ان ذمہ داریوں سے فارغ ہوجائیں، تو پھر عبادت کے لیے تیار ہوجایئے اور پھر اپنے ہی رب کو دیکھیے، کسی اور کو نہ دیکھیے، اپنے رب ہی کی طرف توجہ کیجیے، کسی اور کو دھیان میں نہ لایئے، اپنے پروردگار ہی کی جانب رغبت کیجیے، کسی اور طرف رغبت والتفات ہی نہ کیجیے، تو اس میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سبجیکٹ (Subject) کیا ہے؟ اس آیت کا، اس آیت کی تھیم (Theme) کیا ہے؟ اس آیت کا مقصودِ اعظم کیا ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ اصل مقصود اس کا یہی ہے کہ اللہ کی ذات کو مقصود بنایا جائے اور دیگر چیزوں کو ثانوی درجہ دیا جائے۔

دینی اعمال کی دو قسمیں

دنیا کے کام تو بہ ہر حال دنیا کے کام ہیں، ان کا تو کیا ذکر؟ میں کہتا ہوں کہ جو دینی کام و اعمال ہیں، ان کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں: ایک دینی عمل وہ ہے، جو ''مقصود بالذات'' ہوتا ہے، دوسرا: وہ دینی عمل ہے، جو ''مقصود بالعرض'' ہوتا ہے؛ یعنی خود مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ جیسے علما نے عبادات کی دو قسمیں بتائی ہیں: ایک ''عبادتِ مقصودہ''، جیسے: نماز، روزہ، حج وزکوٰۃ اور دوسری: ''عبادتِ غیر مقصودہ'' جیسے وضو، غسل، مسجد میں داخل ہونا، قرآن پاک کو چھونا وغیرہ، یہ دونوں قسم کے اعمال عبادتیں تو ہیں؛ لیکن ان کے اندر ایک بڑا فرق ہے کہ ان میں سے ایک ''عبادتِ مقصودہ'' ہے، اور دوسری ''عبادتِ غیر مقصودہ'' ہے۔

مقصودہ عبادات کی مثال جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، قربانی، تلاوت، ذکر؛ یہ سب عبادتیں وہ ہیں، جو شریعت میں مقصود بالذات ہیں؛ یعنی بذاتِ خود وہی مقصود ہیں اور کچھ عبادتیں ایسی ہوتی ہیں، جو بذاتِ خود مقصود نہیں ہوتیں؛ بل کہ وہ کسی عبادتِ مقصودہ کا ذریعہ یا وسیلہ ہونے کی وجہ سے مقصود ہوتی ہیں۔

جیسے مثال کے طور پر ''وضو'' عبادت ہے، بہت بڑی عبادت ہے، بہت بڑا ثواب ہے اس کا؛ لیکن اس کے باوجود علما نے لکھا ہے کہ یہ عبادت غیر مقصود عبادت ہے؛ یعنی خود وضو کرنا مقصود نہیں ہے؛ بل کہ وضو کا مقصود یہ ہے کہ وضو کرنے کے بعد نماز پڑھ لیں، وضو کرنے کے بعد ذکر کرلیں، وضو کرنے کے بعد تلاوت کرلیں، وضو کرنے کے بعد کوئی اور عبادت کرلیں؛ دیگر عباداتِ مقصودہ کے لیے اس کو وسیلہ اور ذریعہ قرار دیا گیا ہے، وضو بالذات کوئی عبادت نہیں ہے؛ بل کہ بالتبع و بالعرض عبادت ہے۔

اسی طریقے سے ہمارے اعمال کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک ''اعمالِ مقصودہ'' ایک اعمالِ ''غیر مقصودہ''۔ اعمالِ مقصودہ میں عبادات، نماز، روزہ، زکوٰۃ وحج اور اذکار وغیرہ ہیں، یہ سب اعمال اسلام میں بذاتِ خود مقصود ہیں۔

اور کچھ اعمال ایسے ہیں، جو بذاتِ خود مقصود نہیں ہیں؛ جیسے درس وتدریس خود مقصود نہیں ہے، تصنیف وتالیف خود مقصود نہیں ہے، دعوت وتبلیغ خود مقصود نہیں ہے؛ بل کہ یہ سب ایک مقصود کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں۔ مقصود کیا ہے؟ دین وعلمِ دین کی حفاظت اور دوسرے لوگوں کو دین پر جما دینا وغیرہ ہے؛ اس کے لیے یہ درس و تدریس و وعظ ونصیحت، تقریر وتحریر، تصنیف وتالیف وغیرہ واسطہ ہیں، ذریعہ ہیں، وسیلہ ہیں۔

غیر مقصود کو مقصود کا درجہ دینا بدعت ہے

بھائیو! جب آپ نے اعمالِ مقصودہ اور غیر مقصودہ کو سمجھ لیا، تو اب ان کے بارے میں ایک اصول سمجھ لیجیے! وہ یہ کہ غیر مقصود عبادت کو مقصود عبادت کا درجہ دے دینا بدعت اور مکروہ ہے۔ آپ کہیں گے دلیل کیا ہے؟ ہمارے لیے بہت بڑی دلیل حضراتِ فقہا کا کلام ہے؛ اس لیے کہ حضراتِ فقہا دین کو زیادہ سمجھتے ہیں، حضرات فقہا کو اللہ تعالیٰ تفقہ فی الدین سے نوازتا ہے، اس وجہ سے ان کی بات ہمارے لیے کافی ہے۔

چناں چہ فقہا نے مسئلہ لکھا ہے کہ وضو کرنے کے بعد کسی عبادتِ مقصودہ کے انجام دیے بغیر دوبارہ وضو کرنا بدعت اور مکروہ ہے۔ آپ وضو کر کے آئے، نماز نہیں پڑھی، ذکر بھی نہیں کیا، تلاوت بھی نہیں کیا، کوئی عبادت نہیں کی، پھر چلے گئے وضو کرنے کے لیے، پھر جی چاہا کہ چلو ایک دفعہ اور وضو کریں، بہت بڑا ثواب ہے، اس سے گناہ بھی جھڑ جاتے ہیں، اس لیے ایک دفعہ اور کر لو، تو فقہا لکھتے ہیں کہ

یہ مکروہ ہے، بدعت ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ وضو مقصودہ عبادت نہیں ہے اور غیر مقصود عبادت کو مقصود عبادت کا درجہ دے دینا بدعت ہے۔(۱)

اب یہاں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جس طرح عبادت غیر مقصودہ کو عبادت مقصودہ کا درجہ دینا بدعت و مکروہ ہے، اسی طرح اعمال غیر مقصودہ کو اعمال مقصودہ کا درجہ دے دینا بھی بدعت ہے، اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی اعمال غیر مقصودہ ہی کے پیچھے پڑ جائے کہ اسی کو بار بار کرنے لگے اور اعمال غیر مقصودہ میں اس قدر مصروف ہو جائے کہ اسے اعمال مقصودہ کو انجام دینے کا موقعہ ہی نہ ملتا ہو یا وہ خود ان کو اس اہتمام سے نہ ادا کرتا ہو، اور غیر مقصود اعمال کو ہی سب کچھ سمجھتا ہو تو یہ بھی ایک بدعت ہے، بلکہ شیطان کا بہت بڑا دھوکہ ہے کیونکہ شیطان یہ چاہتا ہے کہ آدمی اگر گناہ میں نہیں تو کم از کم اعمال غیر مقصودہ ہی میں لگا رہے، اور اعمال مقصودہ کو ادا نہ کر سکے۔

(۱) قال الإمام البغوي ناقلاً عن الإمام أحمد في شرح السنة : " و تجديد الوضو مستحب إذا كان قد صلىٰ بالوضوء الأول صلاة و كرهه قوم إذا لم يكن قد صلىٰ بالوضوء الأول صلاة فرضا أو نفلا"

(شرح السنة: ۱/ ۴۴۹، مرقاة المفاتيح: ۲/ ۲۲۵، رد المختار مع شامي: ۱/ ۱۲۹)

اس آدمی کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی صرف وضو ہی کرتا رہے اور نماز نہ پڑھتا ہو، ذکر نہ کرتا ہو، تلاوت نہ کرتا ہو۔ اسی طرح جو لوگ اعمالِ غیر مقصودہ جیسے درس و تدریس، وعظ و بیان، تصنیف و تالیف اور دعوت و تبلیغ میں لگے رہتے ہیں اور نماز و ذکر وغیرہ کی طرف دھیان نہیں دیتے یا ان کو اچھی طرح ادا نہیں کرتے وہ بھی یوں سمجھیں کہ صرف وضو پر وضو کر رہے ہیں اور نماز ہی نہیں پڑھتے۔

مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ اسی فرق کو اور اسی نکتہ کو بتانا چاہتے ہیں کہ اعمالِ غیر

مقصودہ کو ان کے درجے پر رکھا جائے اور اعمالِ مقصودہ کو ان کا درجہ دیا جائے۔

اعمالِ مقصودہ کا درجہ بدلنے کا انجام

آج افسوس ہے کہ امت کا ایک طبقہ جہالت کی وجہ سے اعمالِ مقصودہ اور غیر مقصودہ میں فرق نہیں کر پاتا اور ایک دوسرا طبقہ ہے، جو اس کو جاننے کے باوجود اس کی طرف توجہ نہیں کرتا اور شیطانی دھوکے میں پھنس جاتا ہے۔

اس صورتِ حال کا انجام و نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اعمالِ مقصودہ کو نہ صحیح طریقے پر ادا کرتا ہے اور نہ اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے؛ کیوں کہ یہ بات ظاہر ہے کہ جب آدمی کسی چیز کو مقصود بناتا و سمجھتا ہے، تو اس کا ایک اثر ہوتا ہے دماغ پر، دل پر اور اسی کے ساتھ جذبات اور خیالات پر کہ آدمی اس کام کو عمدہ طریقے پر، پوری دل جمعی کے ساتھ ادا کرتا ہے اور اس کام کو ادا کرنے کے لیے کوشش کرتا ہے کہ دوسرے تمام کاموں سے جلدی جلدی فارغ ہو جائے اور پھر اس اصل و مقصود کام میں لگ جائے۔

اور اگر خدانخواستہ معاملہ الٹا ہو کہ مقصود کام کو غیر مقصود سمجھ لیا؛ مثلاً: مقصود ہے اللہ کو پانا، ایک آدمی نے اس کے خلاف درس و تدریس کو اپنی زندگی کا مقصود بنا لیا، تو اب وہ کیا کرے گا؟ نماز جلدی جلدی سے پڑھے گا اور درس و تدریس کے لیے تیاری کرے گا، ایک آدمی تصنیف و تالیف کو مقصود بنا لیا کہ میری زندگی کا مقصود ہے تصنیف و تالیف، تو اب اسے نماز میں مزہ نہیں آئے گا، توجہ نہیں رہے گی، دل اس میں نہیں لگے گا، دل کہے گا جلدی جلدی نماز پڑھو، یہ کہاں کی مصیبت ہے، جلدی یہاں سے نمٹو اور جا کر اپنا وہ کام کرو اور پھر لکھنے پڑھنے میں مشغول ہو جائے گا، کیوں؟ یہ سب دراصل اسی خیال کا اثر ہے۔ معلوم ہوا کہ اصل کو اصل اور غیر اصل کو غیر اصل سمجھنا چاہیے، اگر اس کا الٹا ہوا، تو نتائج غلط سامنے آئیں گے۔

خواص بھی غلطی میں مبتلا

مگر افسوس کہ اس مسئلے میں عوام تو عوام خواص بھی غلطی میں مبتلا ہیں اور عام طور پر اس میں غلطی ہو رہی ہے اور مقصود کو غیر مقصود، غیر مقصود کو مقصود بنا لینے کی وجہ سے جو مقصود چیز ہے، اس کو تو جلدی جلدی نمٹاتے ہیں اور اپنے دوسرے کاموں کے اندر مشغول ہو جاتے ہیں۔ جو عوام ہیں، وہ تو مقصودِ حیات نماز وغیرہ کو ٹال کر دنیا کے کاموں میں لگ جاتے ہیں، تجارت میں، بیوی بچوں میں وغیرہ اور جو حضراتِ خواص علما و طلبہ ہیں، وہ بھی مقصود عبادات کو جلدی جلدی ادا کر کے درس و تدریس و تقریر و تحریر، دعوت و تبلیغ وغیرہ میں لگ جاتے ہیں۔

چند مثالیں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں:

مثلاً: ایک صاحب کسی جامعہ و مدرسے میں استاذ و مدرس ہیں، وہ سمجھ رہے ہیں کہ مجھے درس بڑا شان دار دینا ہے، اس کے لیے بہت مطالعہ کرنا ہے اور اس میں یہ رُموز اور اسرار منکشف کرنا ہے، یا عجیب و غریب تحقیقات سامنے لانا ہے، محیّر العقول باتیں پیش کرنا ہے اور یہی میری زندگی کا اصل کام ہے، مقصودِ حیات ہے۔ جب ان کے دماغ میں یہ سما گیا، تو اب ان کو کہاں مزہ آئے گا نماز پڑھنے میں، ان کا دل کہے گا نماز جلدی سے پڑھو، الٹی سیدھی نمٹاؤ، سجدہ کرو جلدی سے، رکوع کرو جلدی سے، تلاوت کرو جلدی سے، تمام ارکان کو جلدی سے ادا کرو اور پھر اپنے اصل کام و مقصود کام کے اندر لگ جاؤ۔ کیوں ایسا ہوا؟ اس لیے ہوا کہ انھوں نے اس کو مقصود سمجھا جس کو غیر مقصود سمجھنا چاہیے۔

دوسری مثال لیجیے کہ ایک طالبِ علم نماز کو جلدی جلدی نمٹاتا ہے، رکوع اور سجدے تو بس مرغی کی ٹھونگ کی طرح ادا ہو رہے ہیں؛ کیوں؟ اس لیے کہ اس کے

دماغ میں سمایا ہے کہ اصل کام اس کا یہ ہے کہ اسے تکرار کرنا ہے، سبق یاد کرنا ہے، بڑا عالم بننا ہے اور عربی ادب میں مہارت پیدا کرنا ہے، فقہ وحدیث کا ماہر بننا ہے اور یہی زندگی کا مقصود ہے۔اس خیال کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ اس کو نماز میں، ذکر میں، تلاوت میں کوئی لطف نہیں آتا؛ بل کہ وہ نماز کو بھی بس سر سے ٹلانے پڑھتا ہے، دل سے نہیں پڑھتا۔

حالاں کہ غور کیجیے کہ مدرسہ اس لیے کھولا گیا تھا تا کہ طلبہ خشوع خضوع والی نماز سیکھیں، عالم اس لیے بنایا جارہا تھا کہ وہ ذاکر بنیں، ورنہ تو لغت کا عالم بنانا مقصود نہیں تھا، بہ الفاظِ دیگر اسے عارف بنانا مقصود تھا؛ اس لیے عالم بنایا جارہا تھا اور یہ طالبِ علم ہے کہ اسی علم میں اٹک کر رہ گیا، آگے جو مقصود تھا وہاں تک پہنچا ہی نہیں اس کی وجہ بھی وہی ہے کہ مقصود اور غیر مقصود کی تمیز نہیں ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور مثال عوام کے اعتبار سے سن لیجیے کہ آج کل عموماً اور اہلِ بنگلور میں خصوصا ایک بہت بڑی بیماری یہ چل رہی ہے کہ لوگ صرف بیانات سننے لگے ہیں، آج کسی کا بیان ہے تو کل کسی کا بیان ہے، صبح کسی کا بیان ہے تو شام میں کسی کا بیان ہے اور لوگوں کو بیان سننے کے علاوہ آگے کچھ عملی اقدام کرنا ہی نہیں ہے۔

اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ بیان جو کہ غیر مقصود عبادت ہے، اسے مقصودہ کا درجہ دے دیا گیا اور اس میں ایسا لگ گئے کہ مقصودہ اعمال فوت ہو رہے ہیں، رات دیر تک جلسوں میں مشغول ہو کر فجر کی نماز ترک ہو رہی ہے؛ مگر اس کا کوئی احساس بھی نہیں، بتاؤ کہ یہ شیطانی دھوکہ نہیں تو اور کیا ہے؟

الغرض! اس طرح آپ غور کرتے چلے جائیں، تو آپ کو ایسے بہت سے دین دار ملیں گے، جو دین کے ان کاموں کو جن کا درجہ اعمالِ مقصودہ کا نہیں تھا، ان میں

ایسے منہمک ہو گئے ہیں کہ اعمالِ مقصودہ کو بھول گئے ہیں۔

یہ ایک عظیم غلطی ہے، جو آج کے ماحول میں ہو رہی ہے؛ بڑوں سے، چھوٹوں سے اور علما سے، مفتیوں سے، حدیث پڑھانے والوں سے؛ اللہ حفاظت فرمائے۔

امامِ اعظم ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللہُ نے اللہ کو مقصود بنایا

ہمارے اکابرین ایسے تھے درس بھی، تدریس بھی، تبلیغ بھی، دعوت بھی اور تصنیف بھی، تالیف بھی، تحقیق بھی، مطالعہ بھی اور اسی کے ساتھ ساتھ اللہ کے لیے اتنا بڑا حصہ کہ ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

امامِ اعظم ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللہُ دن بھر درس و تدریس، مسائل کا استنباط و استخراج، قرآن میں حدیث میں غور و فکر، تدبر و تفکر، فقہ کی ترتیب وغیرہ میں مصروف رہتے اور جب شام ہوتی، عشا کا وقت ہوتا، لوگ عشا پڑھ کر چلے جاتے، تو امام اعظم ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللہُ نماز کے لیے رکعت باندھ کر کھڑے ہو جاتے اور یہ رکعتوں کا سلسلہ چلتا رہتا تھا، یہاں تک کہ فجر کا وقت ہو جاتا تھا۔

شروع شروع میں سو رکعت نماز پڑھا کرتے تھے۔ایک دن کہیں جا رہے تھے، راستہ میں ایک شخص نے اپنے ایک ساتھی سے امام ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللہُ کو دکھا کر آہستہ سے کہا کہ یہ جو بزرگ جا رہے ہیں، یہ روزانہ پانچ سو رکعت پڑھا کرتے ہیں۔وہ تو آہستہ سے کہہ رہا تھا؛ لیکن امام صاحب کے کانوں میں اس کی آواز پہنچ گئی۔امام صاحب رَحِمَہُ اللہُ نے کہا کہ اللہ اکبر! یہ میرے بارے میں یہ خیال رکھتا ہے کہ میں پانچ سو رکعت روزانہ پڑھتا ہوں، جب کہ میں صرف سو ہی رکعت پڑھتا ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ میں قرآن کی اس آیت کا مصداق بن جاؤں: ﴿وَيُحِبُّوْنَ أَنْ يُحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا﴾ (اور وہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی

تعریف کی جائے ایسی بات پر، جو انھوں نے نہیں کی)

اگر میں اس کا مصداق بن جاؤں تو کیا ہوگا؟ جہنم کی سزا ہوگی۔ امام صاحب نے کہا کہ لوگ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ میں پانچ سو رکعت پڑھا کرتا ہوں، تو میں آج سے پانچ سو رکعت پڑھا کروں گا اور اس کے بعد سے آپ کا یہی معمول ہوگیا۔

پھر اس کے بعد ایسا ہی واقعہ ہوا کہ ایک دفعہ جا رہے تھے، تو کسی آدمی نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو دکھا کر کہا کہ یہ بزرگ روزانہ ہزار رکعت نماز پڑھا کرتے ہیں؛ حالاں کہ اس وقت پانچ سو رکعت پڑھتے تھے۔ امام صاحب رحمہ اللہ نے اس کی یہ بات سن لی اور کہا کہ اگر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں ہزار رکعات پڑھتا ہوں؛ حالاں کہ میں صرف پانچ سو پڑھتا ہوں، تو مجھے اللہ کے سامنے جواب دینا ہوگا، اس لیے میں آج سے ہزار رکعت نماز پڑھوں گا اور زندگی بھر یہی معمول رہا، کتابوں کے اندر لکھا ہے کہ چالیس برس تک عشا کے وضو سے فجر کی نماز ادا کی، آپ کی پوری پوری رات عبادت کے اندر گزر جاتی تھی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگوں کا عجیب حال تھا۔ دیکھیے! کس طرح اللہ کو مقصود بنا کر زندگی گذاری جاتی ہے؛ لہٰذا پڑھو، لکھو، تحقیق کرو، مطالعہ کرو اور لوگوں کے لیے نیک کام کرو، ہمدردی اور غم خواری کے کام بھی کرو، دعوت وتبلیغ کے کام بھی کرو، لوگوں کو نصیحت کرو، عبرت کی باتیں بتاؤ، اللہ کی طرف ان کو متوجہ کرو؛ لیکن ان ساری چیزوں کے ساتھ کبھی اس کو نہ بھولو کہ میں پیدا ہی ہوا ہوں اپنے رب کے لیے، وہی مقصود ہے، وہی مطلوب۔

امام اوزاعی رحمہ اللہ کی عبادت کا تذکرہ

حضرت امام اوزاعی رحمہ اللہ بہت بڑے عالم تھے، مجتہد تھے اور ان کا بھی

مسلک بہت زمانے تک دنیا میں چلتا رہا تھا، جیسے امام ابوحنیفہ کا، امام شافعی کا، امام مالک کا، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کا مسلک آج چل رہا ہے۔ اسی طرح امام اوزاعی رحمۃ اللہ کا بھی مسلک چلتا تھا؛ لیکن جب ائمۂ اربعہ کا مسلک بہت آگے بڑھ گیا، لوگوں کے اندر اس کو مقبولیت ہوگئی، تو پھر دوسرے ائمہ کے ماننے والے ختم ہوگئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی بہت بڑے مجتہد وامام تھے۔

ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ فجر کے بعد ان کے گھر پر پڑوس کی ایک عورت آئی، امام اوزاعی رحمۃ اللہ گھر میں موجود نہیں تھے، چھوٹا سا گھر تھا، ایک طرف مصلیٰ بچھا ہوا تھا، ایک طرف حضرت کی اہلیہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ عورت آکر ان کے بازو بیٹھ گئی اور کچھ باتیں کرنے لگی، اتنے میں اس کی نظر مصلے پر پڑی، تو وہ عورت حضرت کی اہلیہ سے کہنے لگی: اماں جان! یہ دیکھیے، مصلیٰ بھیگا ہوا ہے، اس پر کسی بچے نے پیشاب کر دیا ہوگا؟

حضرت کی اہلیہ نے کہا کہ ہمارے یہاں تو کوئی بچہ ہے نہیں، ہم بوڑھا، بوڑھی دو ہی آدمی یہاں رہتے ہیں، ہمارے یہاں کوئی بچہ نہیں ہے۔ اس عورت نے کہا کہ اگر بچہ نہیں ہے تو پھر پانی پڑ گیا ہوگا، یہ دیکھیے مصلیٰ بھیگا ہوا ہے، تو حضرت کی اہلیہ نے مصلے پر اپنا ہاتھ پھیرا، تو اس کے اوپر نمی تھی، یہ دیکھ کر کہا کہ یہ نہ پیشاب کی نمی ہے نہ ہی پانی کی نمی ہے، بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے حضرت پوری رات اس مصلے پر روتے رہتے ہیں، وہ تری ان کے آنسوؤں کی وجہ سے ہے، جو تم کو نظر آ رہی ہے۔

حضرت مرۃ ہمدانی رحمۃ اللہ کی عبادت

اسی طرح حضرت مرہ بن شرحبیل ہمدانی رحمۃ اللہ بہت بڑے عالم گزرے ہیں، تابعی ہیں، قرآن کی تفسیر میں ان کا ذکر کثرت کے ساتھ آتا ہے، ان کی عبادت

وریاضت کے بارے میں بہت سے عجیب باتیں منقول ہیں، حضرت حارث الغنوی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ انھوں نے ایسا سجدہ کیا کہ زمین کی مٹی ان کی پیشانی کو کھا گئی۔ روزانہ چھ سو یا ایک ہزار رکعات پڑھا کرتے تھے، حضرت علا بن عبد الکریم کہتے ہیں کہ ہم ان کی خدمت میں آتے، تو ان کے چہرے اور ہاتھ پیر پر سجدے کا اثر نظر آتا، وہ کچھ دیر ہمارے ساتھ بیٹھتے، پھر کھڑے ہو جاتے اور بس نماز پڑھتے رہتے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۷۵/۴، حلیۃ الأولیاء: ۱۶۵/۴)

محمد بن کعب القرظی رحمہ اللہ کا ذکرِ خیر

ایک بزرگ محمد بن کعب القرظی رحمہ اللہ کا ذکر بھی سنتے چلیے، وہ بھی بہت بڑے عالم تھے، تابعی تھے، بہت سے صحابہ سے علم حاصل کیا تھا، بہت متقی واللہ والے تھے، ان کی عبادت اور آہ وبُکا کا حال یہ تھا کہ رات بھر عبادت وریاضت کے ساتھ روتے رہتے تھے، بڑے بے چین ومضطرب نظر آتے تھے، ان کی والدہ نے ایک بار ان سے کہا: ''بیٹا! اگر میں نے بچپن سے اب تک تجھے نیک و پرہیز گار نہ دیکھتی، تو تیرا یہ رونا دھونا دیکھ کر کہتی کہ کوئی بڑا گناہ تجھ سے ہو گیا ہے؛ اس لیے تو ایسا روتا ہے'' اس پر حضرت محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا: ''اے اماں! ہو سکتا ہے کہ اللہ نے مجھے اس وقت دیکھ لیا ہو جب کہ میں کسی گناہ میں مبتلا تھا اور وہ مجھ سے یوں کہہ سکتا ہے کہ جا میں تیری مغفرت نہیں کروں گا۔

(صفۃ الصفوۃ: ۱۳۲/۲، سیر اعلام النبلاء: ۶۵/۵)

بھائیو! یہ تھے ہمارے اسلاف، جو ایک طرف علم کا پہاڑ وسمندر تھے اور علم کی نشر واشاعت، دعوت وتبلیغ، درس وتدریس میں لگے ہوئے تھے، تو دوسری جانب ان کی راتیں ایسی ہوتی تھیں، عبادت وریاضت کا یہ حال تھا۔ اسی لیے امام شافعی

رَحِمَہُ اللہُ کا قول کئی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ میں علما کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ ایک وقت اپنا محض اللہ کے لیے خاص کر کے رکھیں :"وإلى ربک فارغب " والا معاملہ ہے۔

عالم کا کردار حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی نظر میں

اسی لیے حضرت سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے عالم کا کردار کیا ہونا چاہیے اس کے بارے میں فرمایا تھا:

" ينبغي لقارئ القرآن أن يعرف بليله إذا الناس نائمون، وبنهاره إذاالناس مستيقظون، وببكائه إذا الناس يضحكون ، وبصمته إذا الناس يخوضون ، وبخضوعه إذا الناس يختالون ، وبحزنه إذا الناس يفرحون" (قاری یعنی عالمِ قرآن کے لیے مناسب ہے کہ وہ اپنی رات سے پہچانا جائے جب کہ لوگ سوئے ہوئے ہوں اور اپنے دن سے پہچانا جائے جب کہ لوگ بیدار ہوں اور اپنے رونے سے پہچانا جائے جب کہ لوگ ہنس رہے ہوں اور اپنی خاموشی سے پہچانا جائے جب کہ لوگ مباحثہ کر رہے ہوں اور اپنی تواضع سے پہچانا جائے جب کہ لوگ ڈینگیں مار رہے ہوں اور اپنے غم سے پہچانا جائے جب کہ لوگ خوشیاں منا رہے ہوں) (مقدمه تفسير القرطبي)

اس میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ قاریٔ قرآن کے لیے، عالمِ دین کے لیے، دین کو سمجھنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ رات اس طرح گزارے کہ رات سے اس کی پہچان ہو، جب ساری دنیا سو رہی ہو، تو یہ اٹھ کر پڑھ رہا ہو، بیدار رہ کر اللہ کو پکار رہا ہو، نماز پڑھ رہا ہو، دعا مانگ رہا ہو، اللہ کے سامنے گڑگڑا رہا ہو۔

یہ اس کی ادا ہونی چاہیے۔ آج لوگ اس کو بھول گئے ،اس سے بالکل غافل ہو گئے ،عوام بھی بھول گئے ،علما بھی بھول گئے ،طلبہ بھی بھول گئے ، مدرسین بھی بھول گئے ،ان کو یاد ہی نہیں رہا کہ یہ بھی کوئی سبجکٹ (Subject) ہے ہماری زندگی کا، جو ہمارے لیے انتہائی ضروری ہے، بل کہ سب سے زیادہ ضروری ہے۔

کوشش کر کے تو دیکھو!!

آج لوگ کہتے ہیں کہ بڑوں کی اتباع کرنا اوران کے نقشِ قدم پر چلنا ،اللہ کو مقصود بنا کر زندگی گذارنا مشکل ہے ،نماز کو پوری توجہ سے پڑھنا مشکل ہے۔

ہم صرف کہتے ہیں، کوشش نہیں کرتے ،کوشش کریں تو ضرور ہو سکتا ہے۔ دارلعلوم دیوبند میں ’’حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتوی رَحِمَہُ اللّٰہُ ‘‘ جو ’’حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ ‘‘ کے استاذ ہیں اور دار العلوم دیوبند کے سب سے پہلے ناظمِ تعلیمات تھے، صدر المدرس بھی تھے ۔وہ درس دے رہے تھے، دورانِ درس جب یہ حدیث آئی کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ ’’من توضأ وضوئي هذا ثم يصلي ركعتين لا يحدث فيهما بشيء إلا غفر لهٗ ما تقدم من ذنبه‘‘ (جو آدمی میرے وضو کی طرح وضو کرے، پھر ایسی دو رکعتیں پڑھے جس کے اندر کوئی وسوسہ، کوئی خیال نہ آئے، تو اس کے پچھلے گناہ بخش دیے جاتے ہیں) (بخاري: ۱۹۳۴، مسلم: مشكوٰة: ۲۸۷)

حضرت مولانا یعقوب صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اس کی تشریح فرماتے ہوئے کہا کہ ایسی نماز پڑھنے کی کوشش کرنا چاہیے، تو ایک طالبِ علم نے اٹھ کر پوچھا کہ حضرت! ایسا ہو بھی سکتا ہے کہ ہم بغیر وسوسے کے نماز پڑھیں؟ تو اس پر حضرت مولانا یعقوب صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ نے فرمایا کہ پوچھتے ہی رہو گے یا کبھی کرو گے بھی؟

اس کے بعد کہا کہ کرکے دیکھو کیوں نہیں ہوتا؟ اگر نہ ہونے والی بات ہوتی، تو اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کیوں کہتے؟ کیا اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نہ کی جانے والی بات بتانے کے لیے آئے تھے؟ معلوم ہوا کہ انسان میں اس کی طاقت ہے؛ اسی لیے اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا۔

لہٰذا کوشش کرنا ہمارے ذمے ہے، محنت کرنا ہمارے ذمے ہے، جب مجاہدہ کریں گے، تو اللہ تعالیٰ راہیں کھولیں گے۔ آج ہمارا حال یہ ہوگیا کہ ہم دنیا کے لیے تو بہت مجاہدہ کرتے ہیں؛ لیکن اللہ کو مقصودِ زندگی بنانے کے لیے مجاہدہ نہیں کرتے۔

کیا دنیا مقصودِ زندگی ہے کہ جس کے لیے ہم مجاہدہ کریں، کیا اللہ کی ذات غیر مقصود ہے؟ کیا بیوی بچے مقصودِ زندگی ہیں؟ کیا کھانا پینا مقصودِ زندگی ہے؟ کیا تجارت اور منڈیاں مقصودِ زندگی ہیں؟ کیا درس وتدریس مقصودِ زندگی ہے؟ تصنیف وتالیف مقصودِ زندگی ہے؟ نہیں! ہرگز نہیں!! مومن کا مقصودِ زندگی اللہ کی ذات ہے۔

یہی ہے آیت کا مقصود اور مطلوب، جس کو میں سمجھانا چاہتا ہوں کہ اپنے تمام کاموں میں تفریق کریں، تقسیم کریں کہ کون سا کام محض دنیا کا ہے اور کون سا کام مقصود بالغیر ہے اور کونسا کام مقصود بالذات ہے، ان کے بارے میں اسی کے جیسا معاملہ کریں جیسے کہ ان کے ساتھ معاملہ ہونا چاہیے۔ اگر معاملہ ایسا نہیں ہو رہا ہے، تو بھائی! ہم غلطی میں ہیں، اللہ کی اس آیت کی خلاف ورزی میں مبتلا ہیں۔

اب دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اللہ ہی کو مقصودِ زندگی بنا کر زندگی گذارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

"نماز"
کو نماز کیسے
بنائیں؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"نماز" کو نماز کیسے بنائیں؟

الحمد للّٰہ و کفیٰ و سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ . أمابعد

فقد قال اللّٰہ تعالیٰ في القرآن الکریم:

أعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم ، بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم
﴿اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ وَ لَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ﴾
(العنکبوت: ۴۵)

نشانِ سجود تیری جبیں پر ہوا تو کیا
کوئی ایسا سجدہ کر کہ زمیں پر نشاں رہے

محترم دینی بھائیو!

عبادتوں میں سب سے اہم ترین عبادت نماز ہے، مگر آج اس کے اندر بڑی کمی وکوتاہی آ گئی ہے؛ حالاں کہ نماز ہی کے لیے ہم پیدا کیے گئے ہیں اور ہم نماز کے علاوہ سارے کام کر رہے ہیں، تو اس کی مثال ایسی ہوئی کہ کسی آدمی کو ایک اسکول میں ٹیچر واستاذ کے عہدے پر مقرر کیا گیا؛ لیکن وہ سارے اپنے دھندے کرتا ہے، سوائے ٹیچری کے؛ آپ بتایئے کہ اسے تنخواہ ملے گی؟ اور اس کو برداشت کیا جائے گا؟ اسی طرح ایک آدمی کو ایک فیکٹری میں اس لیے لیا گیا کہ فیکٹری میں کچھ چیزیں بنانے کی ہوتی ہیں، تو اس سلسلے میں کام کرے اور وہ آدمی ہے کہ سب کچھ کرتا ہے؛ لیکن وہ کام

نہیں کرتا، جس کے لیے اسے مقرر کیا گیا ہے۔

آج ہم لوگوں کا ایسا ہی حال ہو گیا ہے کہ ہم پیدا ہی کیے گئے اس لیے کہ ہم اللہ کی عبادت کریں اور عبادت میں سب سے اہم ترین عبادت نماز ہے؛ لیکن ہم وہی عمل کرنا نہیں چاہتے۔ ہم کھانا چاہتے ہیں، پینا چاہتے ہیں، رہنا چاہتے ہیں، آرام و آسائش چاہتے ہیں، دنیا کی سب چیزیں کرنے کے لیے تیار ہیں؛ لیکن جس کے لیے پیدا کیے گئے اسی کے لیے تیار نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں ہم سب بڑی غفلت میں مبتلا ہیں۔

بدترین چور

نماز کے بارے میں ایک تو وہ لوگ ہیں، جو نماز ہی نہیں پڑھتے۔ دوسرے وہ جو نماز تو پڑھتے ہیں؛ لیکن نماز کو نماز کے جیسا نہیں پڑھتے؛ حالاں کہ نماز کو نماز کے جیسا پڑھنا چاہیے۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **" أسرق الناس سرقاً الذي يسرق من صلا ته "** (لوگوں میں بدترین قسم کا چور وہ ہے، جو نماز میں چوری کرتا ہے) صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ نماز میں چوری کیسے؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز میں چوری یہ ہے کہ اس کا رکوع و سجدہ ٹھیک نہ ہو۔

(المعجم الكبير للطبراني :٣٥٢٣، مجمع الزوائد : ٢٧٢٢)

ایک حدیث میں فرمایا مرغی جیسا ٹھونگ مارتی ہے، ایسا سجدہ نہ کرو، یہ اللہ کو اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت ناپسند ہے۔

(معجم الأوسط للطبرانی : ٦١٦٠)

ایک آدمی ایک کام کرے؛ لیکن اس طرح نہ کرے جیسے کہ کرنا چاہیے، تو اس کام کا کوئی اعتبار نہیں ہوا کرتا، دنیا کا کوئی بھی کام ہو، جب اس کے اصول وقوانین، اس کے قواعد وضوابط اور اس کے لوازمات اور اس کے طور وطریقے اور مالۂ وماعلیہ کے ساتھ اس کام کو کیا جاتا ہے، تو تب سمجھا جاتا ہے کہ وہ کام ادا ہو گیا اور اگر ایسا نہیں کیا جاتا، تو سمجھا جاتا ہے کہ وہ کام نہیں ہوا۔

اسی سے آپ سمجھ لیجیے کہ نماز کو نماز کے اصول وقوانین کے مطابق نہ پڑھے، تو وہ نماز نماز نہیں ہے۔ قرآن کریم کے اندر اللہ تعالیٰ نے نماز کے کچھ آثار اور نماز پر مرتب ہونے والے ثمرات کو بیان کیا ہے، اسی طرح قرآن وحدیث میں غور کرنے سے ہمیں نماز کو نماز بنانے اور نماز میں خشوع، خضوع پیدا کرنے کے طریقے معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے میں نے ارداہ کیا کہ آپ کے سامنے نماز کے بارے میں کچھ اہم اہم چیزیں بیان کی جائیں، جس سے ہم اپنی نماز کو نماز بنانے میں کامیاب ہوسکیں اور اگر کامیاب نہ بھی ہوئے، تو کوشش ضرور کریں اور کوشش کرنا ہی دراصل کامیابی ہے۔

لیکن اس وقت میرا مقصود نماز کے فقہی مسائل اور نماز کے سنن ومستحبات اور فرائض وواجبات کو ذکر کرنا نہیں ہے؛ بل کہ نماز کی کیفیات اور احوال کو بیان کرنا ہے۔

معروف اور منکر کے معنے

میں نے آپ کے سامنے یہ آیت پڑھی ہے: ﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ (بلاشبہ نماز روکتی ہے، فحش وبے حیائی کے کاموں سے اور منکر یعنی غلط چیز سے) (العنکبوت:۴۵)

شریعت میں منکر ہر اس چیز کو کہتے ہیں، جو غلط ہو اور شریعت کے اندر اس کا کوئی

جواز نہ ہو، ایسی چیز کا نام شریعت میں منکر ہے اور جو چیز شریعت میں جائز ہے اور شریعت نے اس کو مشروع کیا ہے، اس کا نام شریعت میں معروف ہے۔

منکر اور معروف کے لغوی معنے دیکھنے کے بعد پھر قرآن میں اسے جس معنے کے لیے استعمال کیا ہے، اس پر غور کریں گے، تو واقعی قرآن کریم کی بلاغت کا اندازہ ہوگا۔

عربی زبان میں معروف کے معنے آتے ہیں، ''مشہور'' کے، جیسے کہتے ہیں کہ فلاں صاحب بڑے معروف ہیں، تو جو جانا جائے، پہچانا جائے، سب لوگ جانتے ہوں، اس کو کہتے ہیں معروف۔ تو شریعت نے نیکی کا نام معروف رکھ کر یہ بتایا ہے کہ اسلامی معاشرے کے اندر نیکی جانی و پہچانی چیز ہوا کرتی ہے، انجانی کوئی چیز نہیں ہوا کرتی؛ اسی لیے اسلامی معاشرے میں نیکی معروف ہوتی ہے، مشہور ہوتی ہے۔

لیکن آج ہمارے معاشرے میں نیکی، معروف اور جانی پہچانی چیز ہونے کے بجائے انجانی چیز ہوگئی ہے، کہیں کوئی نماز پڑھنے کھڑا ہو جائے، تو لوگ اس کو عجیب نظر سے دیکھیں گے، گویا کہ نہ کرنے کی کوئی چیز کر رہا ہو اور اگر سگریٹ پھونک رہا ہے، تو کوئی نہیں دیکھے گا، ننگا پھر رہا ہے، اسے کوئی نہیں دیکھے گا؛ اس لیے کہ کوئی تعجب کی بات نہیں، کوئی اسے معیوب نہیں سمجھے گا۔

لیکن اگر آپ اسٹیشن میں نماز پڑھنے لگیں، تو غیر تو غیر اپنے بھی کچھ انجانی نگاہوں سے دیکھیں گے، کیا مطلب ہوا؟ آج ہمارے معاشرے کے اندر معروف چیز معروف نہ رہی؛ حالاں کہ وہ تو جانی و پہچانی چیز ہے۔

اور منکر کے معنے آتے ہیں ''انجانی''، جس کو پہچانا نہ جاتا ہو، پتہ نہ ہو کہ کیا چیز ہے؟ اس کا نام ہے اصطلاحِ شریعت میں ''منکر'' اس کا مطلب یہ ہے کہ برائی مسلمان معاشرے میں ایک انجانی چیز ہوتی ہے، اس کو کوئی پہچانتا نہیں کہ کیا ہے؟

شراب کو مسلمان نہیں جانتا کہ یہ کیا ہے؟ جھوٹ وغیبت کو مسلمان سمجھتا ہی نہیں کہ یہ کیا ہے؟ اس لیے کہ اسلامی معاشرے میں اس کا رواج نہیں ہوتا۔

اس میں اللہ نے بتادیا ہے کہ اسلامی معاشرے میں نیکی تو معروف ہوتی ہے؛ اس لیے اس کا چلن اسلامی معاشرے میں ضرور ہونا چاہیے اور جو چیز غلط وحرام و ناجائز ہے، وہ منکر ہے؛ اس لیے اسلامی معاشرے میں یہ انجانی ہونی چاہیے اور لازمی طور پر اس کا چلن بھی معاشرے میں نہ ہونا چاہیے۔

نماز ہمیں برائیوں سے کیوں نہیں روکتی؟

مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡهٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ﴾ (بلاشبہ نماز روکتی ہے، فحش و بے حیائی کے کاموں سے اور منکر یعنی غلط چیز سے) اس سے معلوم ہوا کہ نماز پڑھنے کے بعد نماز کا یہ اثر مرتب ہونا چاہیے کہ نماز نمازی کو برائیوں سے روکے، ورنہ وہ نماز جب بے حیائی و منکر سے نہیں روکتی، تو اللہ تعالیٰ نے یہ کیسے فرمادیا کہ نماز ان سے روکتی ہے؟

یہاں پر ایک سوال علما نے کھڑا کیا ہے کہ جب نماز ہر فحش و برائی سے روکتی ہے، زنا سے، چوری سے، ڈکیتی سے، جھوٹ سے، دھوکے بازی سے، غیبت سے، چغلی سے، ظلم زبردستی سے، تو اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ نماز پڑھ رہے ہیں؛ لیکن جھوٹ بھی بول رہے ہیں، غیبت بھی ان سے جاری ہے، دوسروں کا مال بھی لوٹ رہے ہیں، غصب بھی کر رہے ہیں، حرام کاموں میں بھی مبتلا ہیں، یہ سب ناجائز کام کر رہے ہیں، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب بعض حضرات نے یہ دیا ہے کہ نماز روکتی تو ہے؛ لیکن لوگ رُکتے نہیں، تو اس سے آیت پر کیا اشکال؟ اللہ نے یہ تو نہیں کہا کہ تم رک بھی جاؤ گے۔ نماز

ایسی چیز ہے، جوروکتی ہے۔ جیسے مولانا حضرات بہت سے بُرے کاموں سے روکتے ہیں، کہ برائی نہ کرو، حرام نہ کرو؛ لیکن لوگ سن کر نہ مانیں اور الٹا سیدھا کرتے رہیں، تو مولانا پر کیا اشکال واعتراض؟

دوسرا جواب: جو بہت عمدہ وحقیقت کُشا ہے، یہ ہے کہ آیت کا منشا یہ بتانا ہے کہ نماز اگر واقعی نماز ہو، تو بے شک اس کا اثر یہ مرتب ہوگا کہ آدمی واقعی گناہ سے بچنا شروع کردے گا؛ لیکن نماز کو پہلے نماز تو بنانا چاہیے، نماز حقیقت میں نماز ہو، اس کے اندر وہ کمال، وہ خشوع، وہ خضوع ہو اور اخلاص ہو، جب اس طرح نماز پڑھی جائے گی، تو اس کا اثر یہی ہوگا کہ جب آدمی برائی کی طرف جانا چاہے گا، تو اس کے سامنے نماز آئے گی کہ ابھی تو نماز پڑھ کے آیا ہے، کیا حرکت کرنے جارہا ہے؟ تو یہ آدمی فوراً برائی سے رُک جائے گا۔ اس تقریر سے اس سوال کا جواب سامنے آ گیا کہ ہماری نماز ہمیں کیوں برائی سے باز نہیں رکھتی؟ معلوم ہوا کہ دراصل ہماری نماز نماز ہی نہیں ہوئی ہے، اگر نماز نماز ہو جائے، تو اس کا یہ اثر ضرور مرتب وظاہر ہوگا۔

ایک عبرت ناک حدیث

نماز کا یہ اثر مرتب ہونا نماز کے نماز ہونے کی علامت ہے اور اگر یہ اثر اس کا نہ مرتب ہو، تو اس پر حدیث میں وعید آئی ہے؛ چناں چہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "مَنْ لَمْ تَنْهَهُ صَلَاتُهُ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْفَحْشَاءِ لَمْ يَزْدَدْ مِنَ اللّٰهِ إِلَّا بُعْداً"

(جس آدمی کی نماز اسے برائی و بے حیائی سے نہ روکے، تو اس کی یہ نماز اللہ سے دوری میں اضافے کا ذریعہ ہوگی) (المعجم الکبیر للطبراني: ۱۰۸۶۲)

معلوم ہوا کہ نماز کے نماز ہونے کی پہچان اور علامت یہی ہے کہ وہ برائیوں

سے روکتی ہے، اگر نماز برائیوں سے نہ روکے، تو وہ نماز نہیں؛ بل کہ اللہ سے بُعد و دُوری کا ذریعہ ہے، جب آدمی واقعی نیکیوں پر چلنے لگتا ہے اور نماز کو واقعی طور پر پڑھتا ہے، اس میں اخلاص وللّٰہیت کا، خشوع وخضوع کا اور دل جمعی کا لحاظ رکھتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کی حالت پلٹ دیتے ہیں، بُرا انسان بھی اچھا ہو جاتا ہے، اس کی برائیاں چھوٹنے لگتی ہیں، اس میں روز بروز سدھار ونکھار آتا جاتا ہے۔

نماز برائیوں سے کیسے روکتی ہے؟ - ایک چور کا واقعہ

میرے شیخ ومرشد حضرت مسیح الامت رَحِمَہُ اللّٰہُ نے ایک واقعہ سنایا تھا کہ کسی زمانے میں ایک چور تھا، وہ ایک بادشاہ کے محل میں چوری کرنے کے ارادے سے گیا، رات کا وقت تھا اور محل کے ایک کمرے سے بادشاہ اور اس کی بیوی کی گفتگو کی آواز آرہی تھی، وہ کھڑے ہو کر سننے لگا، اگرچہ ایسا سننا ناجائز ہے، حرام ہے، چوری ہے؛ لیکن چور چوری ہی کرنے آیا تھا، تو اسے سننے میں کیا چیز مانع ہوتی ؟ آخر کو وہ چور ہی تو تھا؟ تو اس نے سنا کہ بادشاہ اپنی بیوی سے کہہ رہا ہے اور اس کی بیوی ہاں میں ہاں ملا رہی ہے کہ میں اپنی بیٹی کی شادی ایسے آدمی سے کروں گا، جو نہایت متقی و پرہیز گار ہو، جو بہت بڑا اللہ والا ہو، جب چور یہ بات سن رہا تھا، تو اس کے دل میں آیا کہ کیوں نہ میں ہی کچھ ایسا بن کر دکھاؤں کہ میرے ہی ساتھ شہ زادی کی شادی بادشاہ کردے۔ دل میں ایک حرص پیدا ہوگئی، اب وہ چوری کو تو بھول گیا؛ لیکن دھوکے پر اتر آیا اور گھر میں جا کر بہت دیر تک سوچنے لگا کہ کس طرح میں اس بات میں کامیاب ہو سکتا ہوں؟ تو ایک تدبیر اس کی سمجھ میں آئی کہ بادشاہ کے محل کے قریب ایک مسجد ہے، اس مسجد میں جا کر بزرگانہ لباس پہن کر اور ان کی وضع قطع اختیار کر کے وہاں دن رات عبادت میں مشغول ہو کر بیٹھ جاؤں، تو شُدہ شُدہ بادشاہ

تک بات پہنچے گی کہ کوئی آدمی یہاں ایسا متقی پرہیز گار ہے، جو دن رات اللہ کی عبادت میں مصروف ہے، تو ہوسکتا ہے کہ بادشاہ کی نگاہِ انتخاب میرے اوپر پڑ جائے اور میں چن لیا جاؤں اور شہزادی سے میری شادی ہو جائے۔

بھائیو! یہ اس کا ایک نہایت حقیر اور ذلیل دنیوی مقصد تھا، جس کے لیے اس نے یہ ارادہ کیا اور اس نے اپنے پروگرام کے مطابق بزرگانہ لباس و پوشاک، وضع قطع اختیار کر کے اس مسجد میں جا کر نمازوں پر نمازیں، ذکر و تلاوت، مراقبہ سب شروع کرلیا۔ اب زمانہ چلتا رہا، لوگوں میں شہرت ہوتی گئی کہ کوئی اللہ کے بہت بڑے ولی یہاں آ گئے ہیں، جو دن رات عبادت کرتے ہیں۔ اب اس کی وجہ سے لوگوں کی آمد و رفت کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ بادشاہ تک خبر پہنچ گئی کہ یہاں کوئی اللہ والے آ کر بیٹھے ہیں، ہیں تو جوان؛ لیکن زُہد و عبادت میں لاجواب تقویٰ و طہارت میں بے نظیر، جب بادشاہ کو یہ بات معلوم ہوئی، تو اپنے ارادے کے مطابق غور و فکر شروع کر دیا کہ شہزادی کے متعلق جو سوچا تھا، اس کے لیے اسی کا انتخاب کرلیا جائے۔

بادشاہ نے اس سلسلے میں گفتگو کے لیے اپنے وزیر کو بھیجا، وزیر اس شخص کے پاس مسجد میں پہنچا اور اس نے باادب اس سے کہا کہ میں آپ کی خدمتِ عالیہ میں بادشاہ جہاں پناہ کی طرف سے آیا ہوں، ایک پیغام لے کر۔ اس نے کہا کہ کیا پیغام ہے؟ وزیر نے بتایا کہ بادشاہ نے کئی سال پہلے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اپنی لڑکی کا نکاح ایک ایسے شخص سے کریں گے، جو بڑا ہی متقی و پرہیز گار ہو، اللہ والا ہو اور وہ اس کی تلاش میں تھے، اب جو نظر گئی، تو نظرِ انتخاب آپ پر آ کر رُک گئی ہے؛ لہٰذا بادشاہ نے مجھے بھیجا ہے کہ اس سلسلے میں آپ سے گفتگو کروں، اگر آپ اس کے لیے تیار ہوں، تو فرمایئے، اگلی نشست کے اندر اس سلسلے کی کوئی کارروائی آگے بڑھائی جائے گی۔

یہ شخص جو دراصل اسی تمنا و آرزو میں یہاں آکر بیٹھا تھا، وہ بہت دیر تک یہ وزیر کی گفتگو سنتا رہا،اس کے بعد اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، وزیر نے پوچھا کہ کیا بات ہوگئی؟ تو کہنے لگا کہ آج جو پیغام لے کر آپ آئے ہیں، یہ پیغام مجھے منظور نہیں ہے۔ وزیر نے کہا کہ کیوں منظور نہیں؟ اس نے کہا کہ دیکھیے! میں صاف صاف بات آپ کو بتاتا ہوں کہ میں اصل میں ایک چور تھا اور میں بادشاہ کے محل میں چوری کے ارادے سے ایک مرتبہ گیا تھا؛ پھر جو کچھ بھی ہوا اس کو سنایا اور اس کے بعد اس چور نے کہا کہ میں نے تو یہ وضع قطع اسی حرص کی وجہ سے اختیار کی تھی؛ لیکن جب میں یہاں آکر بیٹھا، تو خدا نے مجھے اپنا بنالیا، اب بس اس کے بعد مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔

اللہ اکبر! جب عبادت عبادت ہو جائے، نماز نماز ہو جائے اور ذکر ذکر ہو جائے اور ہماری دیگر عبادتیں واقعی عبادتیں ہو جائیں، تو بے شک یہ نمازیں اور عبادتیں انسان کو برائیوں سے روکتی ہیں۔

اللہ کے عظیم دربار کا تصور کریں

بہ ہر حال! مجھے یہ کہنا ہے کہ آج ہمیں ہماری نمازوں کو نماز بنانے کی ضرورت ہے؛ لہٰذا میں اس سلسلے میں چند اہم امور کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں، جس سے ان شاء اللہ نماز کو نماز بنانا آسان ہو جائے گا۔

پہلی بات: یہ ہے کہ جب ہم نماز کا ارادہ کرتے ہیں، تو سب سے پہلے ہم وضو کرتے ہیں، تو وضو کے وقت ہی اس کا تصور جمانا شروع کردیں کہ میں وضو کرنے کے بعد اللہ کے عظیم شاہی دربار میں جانے والا ہوں، عظیم خالق کے دربار میں، احکم الحاکمین کے دربار کے اندر حاضری کے لیے مجھے جانا ہے۔

حضرت زین العابدین علی ابن الحسن رحمہ اللہ کے واقعات میں ہے کہ آپ جب وضو کرنے بیٹھتے تھے، تو آپ کے چہرے پر تغیر آجاتا تھا، ایک رنگ آتا ایک جاتا تھا، چہرے کے تغیر کو دیکھ کر لوگ پوچھا کرتے تھے کہ حضرت! آپ وضو کرتے ہیں، تو آپ کی حالت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے، چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ کیا تمھیں یہ نہیں معلوم کہ وضو کرنے کے بعد کس کے دربار میں جانا ہے؟ یعنی جب اللہ کے دربارِ عالی میں جانا ہے، تو اس کی ہیبت کی وجہ سے یہ اثرات ہوتے ہیں۔

اس طرح جب اللہ کے دربار میں جانے کا تصور قائم ہو جائے گا اور پھر اللہ کی عظمت و بڑائی اور اس کی جلالت و کبریائی کا تصور بھی کیا جائے گا اور سوچا جائے گا کہ اگر ہم دنیا کے کسی بادشاہ کے دربار میں جائیں گے، تو ہماری کیا حالت ہوتی ہے؟ کیا کسی شاہی دربار میں آدمی ایسے ہی چلا جاتا ہے؟ بے خبری اور غفلت کے ساتھ اندر چلا جاتا ہے؟ نہیں! بل کہ جب وہاں جاتا ہے، تو اسے پورا احساس ہوتا ہے کہ میں ایک بڑے آدمی کے دربار میں جا رہا ہوں، بادشاہ کے عظیم دربار میں جا رہا ہوں؛ لہٰذا جب یہ سوچتا ہوا جاتا ہے، تو اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس پر رُعب و جلال کا اثر نمایاں ہوتا ہے۔

لیکن ہم خدا کے دربار میں جاتے ہیں، تو سوچے سمجھے بغیر چلے جاتے ہیں، اس لیے مسجد کو جاتے ہوئے اللہ کے رعب و جلال کا کوئی اثر ہم پر نمایاں نہیں ہوتا۔ اس لیے جب نماز کے لیے جائیں، تو سوچ کر، سمجھ کر اللہ کے دربار کی عظمت کا تصور کرتے ہوئے جائیں اور پورے وقار کے ساتھ جائیں، ایسے طریقے سے نہ جائیں جو وقار کے خلاف ہو۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے مسجد میں دوڑ کر جانے سے منع فرمایا ہے اور حکم دیا ہے کہ اطمینان کے ساتھ جاؤ، وقار کے ساتھ اللہ کے دربار میں جاؤ، اگر تم کو پوری نماز مل گئی تو الحمد للہ، نہ ملی تو بقیہ نماز اپنے طور پر مکمل کرو، نماز کو پانے کے لیے مسجد میں دوڑتے ہوئے جانا، یہ آدابِ دربارِ الٰہی کے خلاف ہے۔

چناں چہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ **"إذا أقيمت الصلاة فلا تأتوها تسعون ائتوها تمشون ، عليكم السكينة ، فما أدركتم فصلوا وما فاتكم فاقضوا"** (جب نماز کھڑی ہو جائے، تو تم دوڑ کر نماز کو نہ آؤ؛ بل کہ چل کر آؤ، اس طرح کہ تم پر وقار ہو، پس جو نماز مل جائے اس کو پڑھ لو اور جو نہ ملے تو قضا کرلو)

(بخاری: ۱/۱۲۴، مسلم: ۱/۲۲۰، صحیح ابن خزیمہ: ۲/۷۷۱)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ جب نماز کے لیے جاتے تھے، تو اس قدر آہستہ آہستہ چلتے تھے جیسے چیونٹی چلتی ہے، حتیٰ کہ ان کے ایک شاگرد کہتے ہیں کہ اگر ان کے ساتھ چیونٹی بھی چلتی، تو وہ اس سے بھی آگے نہ ہوتے۔

(حياة الصحابة: ۲/۱۷)

الغرض! اسی تصور کے ساتھ اگر مسجد میں جائیں گے، تو نماز کے اندر بھی وہی تصور رہے گا اور اس تصور کو باقی رکھنا آسان ہو جائے گا اور جو آدمی کہ باہر کے خیالات کے ساتھ اور اِدھر اُدھر کے تصورات کے ساتھ اللہ کے دربار میں کھڑا ہوگا، تو اسے کوئی احساس نہیں ہوگا کہ میں اللہ کے دربار میں کھڑا ہوا ہوں؛ بل کہ دنیا ہی اس کے ذہن میں آتی رہے گی۔ اس لیے یہ سب سے پہلا اصول و ادب اور طریقہ

ہے کہ نماز کو جانے سے پہلے ہی اللہ کے دربار کا جلال اور اس کی عظمت و بڑائی کا تصور قائم کرلیا جائے۔

مسجد میں داخل ہونے کی نیت و دعا

دوسری بات: یہ ہے کہ جب ہم مسجد جائیں، تو مسجد میں داخل ہونے کی نیت بھی کریں اور دعا بھی پڑھیں، سب گھروں میں آپ بغیر نیت کے جائیں، کوئی مضائقہ نہیں؛ لیکن اللہ کے گھر میں جاؤ، تو نیت کر کے جاؤ کہ میں اعتکاف کی نیت کرتا ہوں؛ اس لیے کہ جب نیتِ اعتکاف کے ساتھ مسجد میں جائیں گے، تو جب تک مسجد میں رہیں گے اور وہاں نماز پڑھیں گے، ذکر کریں گے، تلاوت کریں گے اور کوئی نیک کام کریں گے، تو ہر ایک کے ثواب کے ساتھ آپ کو اعتکاف کا بھی ثواب مل جائے گا اور اگر کسی وقت کوئی اور عبادت نہ کرسکیں، تب بھی اعتکاف کا ثواب جاری رہے گا؛ اس لیے اعتکاف کی نیت کر کے جاؤ، نیت کے ساتھ دعا پڑھو، دعا کیا ہے؟ "**بِسْمِ اللّٰهِ ، اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ ، اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ رَحْمَتِکَ**" (عمل اليوم والليلة:١٦٧، الأذكار للنووي: ٤٤)

ایک بات یاد رکھیں کہ دعا کی جاتی ہے، پڑھی نہیں جاتی، آج ہمارا حال یہ ہے کہ دعا کرتے نہیں ہیں، دعا پڑھ لیتے ہیں، یہ بات صحیح نہیں۔ دعا پر غور کرو کہ ہم کیا پڑھ رہے ہیں؟ اس دعا کا مطلب یہ ہے کہ "اے اللہ! اپنی رحمت کے دروازے میرے لیے کھول دے"۔ معلوم ہوا کہ مسجد میں آنے پر اللہ کی طرف سے رحمت کے دروازے کھولے جاتے ہیں، ورنہ اس موقعے پر یہ دعا کیوں تجویز کی جاتی؟ یہ مسجد میں داخلے کا وقت، رحمت کے دروازے کھلنے کا وقت ہے؛ اس لیے اس موقعے پر یہ دعا تلقین کی گئی ہے۔ اگر اللہ کے دربار میں حاضر ہوتے ہوئے یہ دعا دل کی گہرائیوں

سے کریں گے اور دعا کو دعا بنا کر کریں گے اور اللہ سے التجا کی جائے گی، تو رحمت کے دروازے کھل جائیں گے؛ پھر بتاؤ کہ ہمارا کونسا مسئلہ اٹکا ہوا ہوگا؟ صحت کا، یا کھانے، پینے کا یا تجارت کا، ملازمت کا یا شادی کا یا کوئی اور مسئلہ؟ اسی طرح دین و آخرت کا کوئی مسئلہ ہو، نجات کا، فلاح کا، کامیابی کا، حساب و کتاب کا۔

الغرض دین و دنیا کے جو بھی مسئلے حل ہوتے ہیں وہ اللہ کی رحمت سے حل ہوتے ہیں، اگر خدا کی رحمت رُک جائے، تو پھر انسان زندہ بھی نہیں رہ سکتا؛ اس لیے اس وقت خوب توجہ سے دعا کرتے ہوئے مسجد میں داخل ہونا چاہیے۔

مسجد میں داخلے کا ادب اور حضرت گنگوہی رحمہ اللہ

جب ہم مسجد جائیں، تو سب سے پہلے ہم اپنے جوتے سے بایاں پیر نکالیں اور داہنے پیر سے مسجد میں داخل ہوں؛ اس لیے کہ یہاں ایک تو جوتے نکالنے کا ادب بھی ہے اور ایک مسجد میں داخل ہونے کا ادب بھی، جوتے نکالنے کا ادب یہ ہے کہ پہلے بایاں پیر نکالو اور مسجد میں داخل ہونے کا ادب یہ ہے کہ پہلے سیدھا پیر داخل کرو۔

ایک عالم صاحب حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے مرید تھے، وہ کہتے ہیں کہ جب میں کتابوں میں یہ پڑھتا تھا کہ مسجد میں جاتے ہوئے پہلے بائیں پیر سے جوتا نکالو اور مسجد میں داہنا پیر داخل کرو، تو مجھے اشکال ہوتا تھا کہ یہ دونوں باتیں کیسے جمع ہوسکتی ہیں؟ نکالنا ہے بائیں پیر سے جوتا، داخل کرنا ہے سیدھا پیر، تو وہ کہتے ہیں کہ میں حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے پاس گیا اور جانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ میں یہ دیکھوں کہ حضرت رحمہ اللہ اس سنت پر کیسے عمل کرتے ہیں؟ جب نماز کا وقت آیا، تو حضرت کے ساتھ ساتھ نماز کو گیا اور جب مسجد میں داخل ہوئے، تو وہاں دیکھتا رہا کہ حضرت مسجد میں کیسے داخل ہوتے ہیں؟

وہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت گنگوہی رَحِمَہُ اللہُ کو دیکھ رہا تھا کہ حضرت نے پہلے اپنا بایاں پیر جوتے سے نکال کر جوتے ہی پر رکھ لیا، پھر اپنا داہنا پیر جوتے سے نکال کر سیدھے مسجد کے اندر رکھا۔ اب مجھے سمجھ میں آ گیا کہ اس طریقے پر دونوں باتوں، دونوں سنتوں پر عمل ہو سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعت پر عمل سیکھنے سے آتا ہے اور وہ سیکھنا اللہ والوں کی صحبت سے میسر ہوتا ہے۔

ادبِ مسجد اور "سفیان ثوری" کا واقعہ

بہر حال! مسجد میں بھی اسی تصور کے ساتھ ادب کا لحاظ رکھتے ہوئے جانا چاہیے کہ میں اللہ کے دربار میں داخل ہو رہا ہوں۔

واقعہ سنا ہوگا "حضرت سفیان ثوری رَحِمَہُ اللہُ" کا کہ ایک مرتبہ مسجد میں بے خیالی کے ساتھ چلے گئے اور مسجد میں اپنا داہنا پیر پہلے داخل کرنے کے بہ جائے بائیں پیر سے داخل ہو گئے، تو فوراً الہام ہوا اور اس الہام میں ان سے کہا گیا کہ اے ثور! یعنی (اے بیل) کیا ہمارے دربار میں آنے کا یہی ادب و طریقہ ہے؟ اللہ نے ان کو بیل کہا؛ اس لیے کہ یہ جو بیل و گدھے ہوتے ہیں، ان کے لیے کوئی اصول نہیں ہوتا، جو چاہے پہلے رکھو اور جو چاہے بعد میں رکھو؛ لیکن انسان ہو کر بھی یہی بے اصولی کرے، تو یہ بات قابلِ گرفت ہوتی ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت سفیان ثوری کو "ثوری" اسی واقعے کی وجہ سے کہتے ہیں؛ مگر اس میں اشکال ہے؛ کیوں کہ ثوری میں یائے نسبت لگی ہوئی ہے؛ اس لیے اس کا معنیٰ تو یہ ہوگا کہ "بیل والا" حالاں کہ اللہ نے ان کو خود بیل کہا ہے نہ کہ بیل والا؛ اس لیے صحیح بات یہ ہے کہ ثوری ان کو ایک قبیلے کی طرف نسبت کی وجہ سے کہتے ہیں۔

الغرض جب یہ الہام ہوا، تو فوراً اللہ کے سامنے سجدے میں پڑ گئے، رونے

اور گڑگڑانے لگے اور معافی مانگنے لگے؛ لہٰذا مسجد میں داخل ہوتے ہوئے اس ادب کا لحاظ و دھیان ہونا چاہیے۔

نماز ایسی پڑھو، جیسے زندگی کی آخری نماز ہو

اب آپ مسجد میں داخل ہو گئے اور نماز پڑھنا چاہتے ہیں، تو نماز شروع کرنے سے پہلے کیا تصور ہونا چاہیے؟ اس سلسلے میں ایک بات حدیث میں آتی ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ "إِذَا صَلّٰی أَحَدُکُمْ فَلْیُصَلِّ صَلَاۃَ مُوَدِّعٍ صَلَاۃَ مَنْ لَا یَظُنُّ أَنَّہٗ یَرْجِعُ إِلَیْھَا أَبَداً" (کنز العمال:۲۰۰۷۷)

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے، تو اس کو چاہیے کہ اس طرح نماز پڑھے، جیسے کوئی رخصت ہونے والا نماز پڑھتا ہے؛ یعنی جیسے وہ شخص جس کو یہ یقین نہ ہو کہ پھر دوبارہ نماز پڑھ سکے گا۔

یہی بات ایک اور حدیث میں آئی ہے کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے آکر آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے درخواست کی۔ انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھ کو نصیحت فرمائیے؛ لیکن مختصر فرمائیے۔ (صحابہ رضی اللہ عنہم کی بھی عجیب بے تکلفی تھی)، تو ان کی درخواست پر اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا کہ " إِذَا قُمْتَ فِيْ صَلَاتِکَ فَصَلِّ صَلَاۃَ مُوَدِّعٍ" (جب تم نماز پڑھو، تو ایسی نماز پڑھو جیسا کہ رخصت ہونے والا پڑھتا ہے۔

(ابن ماجہ:۴۱۷۱، مسند أحمد: ۲۳۴۹۸، معجم کبیر طبراني:۱۲۸/۴)

اس حدیث میں ہمیں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ہم جب نماز پڑھیں، تو اس طرح پڑھیں جیسے رخصت ہونے والا نماز پڑھتا ہے، رخصت ہونے والے سے کیا مراد ہے؟ شارحینِ حدیث نے اس کا ایک مطلب یہ بیان فرمایا کہ اس سے مراد وہ

ہے، جو لوگوں کو رخصت کرنے والا ہو، تو جس طرح لوگوں کو رخصت کرنے والا رخصت کرکے اپنے کاموں میں پوری طرح منہمک ومشغول ہوجاتا ہے، اسی طرح نماز پڑھنے والے کو بھی چاہیے کہ وہ سب کو رخصت کردے اور دل سے نکال دے اور اللہ کی جانب پوری طرح متوجہ ہوجائے۔ علامہ مناوی نے ایک مطلب یہی لکھا ہے۔ (دیکھو: فیض القدیر: ۶/ ۴۸۹)

اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس سے مراد مرنے والا اور سب کو چھوڑ کر اللہ کے دربار میں حاضر ہونے والا ہے، گویا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نماز اس طرح پڑھو، جیسے یہ تمھاری آخری نماز ہو اور اس کے بعد پھر تم کو اس کا موقعہ نہ ملے گا اور اس کی تائید خود حدیث کے ان جملوں سے ہوتی ہے، جیسے اوپر کی حدیث میں فرمایا کہ "صَلَاةَ مَنْ لَا يَظُنُّ أَنَّهُ يَرْجِعُ إِلَيْهَا أَبَداً" (یعنی اس شخص کی سی نماز، جس کو دوبارہ نماز پڑھنے کا یقین نہ ہو) اور ایک حدیث میں اس طرح فرمایا کہ "صلاة مودع كأنك لا تصلي بعدها" (مسند الشهاب: ۲/ ۹۳)

اس سے معلوم ہوا کہ نماز ایسی پڑھنا چاہیے کہ یہ یقین ہو کہ یہ میری زندگی کی آخری نماز ہے اور یہ سمجھو جیسے تمھاری موت آرہی ہو اور جو نماز تم پڑھنے جارہے ہو، وہ تمھاری آخری نماز ہے۔

اللہ اکبر! کیا عجیب نصیحت کی اللہ کے نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے؛ لہٰذا جب نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوں، تو اللہ کے نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے اس ارشادِ مبارک کو بھی ذہن میں لے آؤ! "ہوسکتا ہے کہ اس کے بعد مجھے موقعہ نہ ملے، یہی میری آخری نماز ہو، یہی رکوع وسجدہ میرا آخری رکوع وسجدہ ہے، یہ میرا "اللہ اکبر" کہنا آخری ہے، جب آدمی یہ سوچ کر نماز پڑھے گا، تو آپ اندازہ کرلیجیے کہ اس کی

نماز کیسی شان دار ہوگی۔

گویا کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو

پھر جب نماز شروع کرو، تو یہ سمجھو کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں یا کم از کم اللہ تو مجھے ضرور دیکھ رہے ہیں۔ایک حدیث میں ہے کہ جب حضرت جبریل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ احسان کیا ہے ؟ تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **"أن تعبد اللّٰہ کأنک تراہ فإن لم تکن تراہ فإنہٗ یراک"** (نماز اس طرح پڑھ، عبادت اس طرح کر گویا تو اللہ کو دیکھ رہا ہے، اگر اتنی طاقت تیرے اندر نہیں ہے، تو یہ خیال کر کہ اللہ تجھ کو دیکھ رہا ہے)

(البخاری: ۱/۱۲، مسلم: ۱/۲۷)

اس حدیث میں نمازی کے دو حال بتائے ہیں، ان دو میں سے ایک حال ضرور ہوگا، ایک یہ کہ نمازی یہ خیال کرے کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں، یہ تو بہت مشکل ہے؛ اسی لیے حدیث میں یہ کہا کہ **"کأنک تراہ"** (گویا کہ تو اللہ کو دیکھ رہا ہے) "گویا کہ" کیوں فرمایا؟ اس لیے کہ حقیقت میں دیکھ تو نہیں رہا ہے، صرف تصور کرنا ہے؛ اس لیے دیکھنے والے کی طرح ہو گیا ہے اور اگر اتنا خیال جمانا مشکل ہو، تو دوسرا حال یہ ہے کہ خیال کرے کہ اللہ مجھے دیکھ رہے ہیں، میرے عمل کو، میرے سکون کو، میری ہر ادا کو، اٹھنے اور بیٹھنے کو سب کو دیکھ رہے ہیں۔

جیسے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے

﴿الَّذِیْ یَرٰیکَ حِیْنَ تَقُوْمُ وَتَقَلُّبَکَ فِی السّٰجِدِیْنَ﴾

(الشعراء: ۲۱۹)

اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمارہے ہیں کہ ہم آپ کو دیکھ رہے

ہیں؛ جب کہ آپ نماز میں کھڑے ہوتے ہیں اور "ساجدین" میں یعنی نماز پڑھنے والوں میں، جو آپ کا تقلب ہو رہا ہے، رکوع، سجدہ، جھکنا اور اٹھنا یہ سب ہم دیکھ رہے ہیں۔

کیا عجیب جملہ ہے، حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے خطاب ہے کہ اے نبی! آپ کا اٹھنا اور آپ کا بیٹھنا اور آپ کا رکوع وسجدہ، جو نمازیوں کے درمیان ہو رہا ہے، یہ اللہ دیکھ رہے ہیں اور اللہ کے علم میں موجود ہے ۔یہ سن کر حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو کیا مزہ آیا ہوگا؟ جب معشوق ومحبوب دیکھ رہا ہو اور عاشق اس تصور کے ساتھ ہو کہ وہ میرا محبوب مجھ کو دیکھ رہا ہے، تو اس وقت آپ کی نماز میں جو لطف اور مزہ اور کیف پیدا ہو رہا ہوگا، اس کا تو کوئی تصور ہی نہیں کر سکتا۔

الغرض! اس طریقے پر اللہ تعالیٰ کے دیکھنے کا اور اس کے جاننے کا یقین ہمارے دلوں میں ہونا چاہیے، جب نماز شروع کرنے سے پہلے ہم اتنے مراحل سے گزریں گے، تو بھائیو! نماز میں وہ کیفیتیں پیدا ہوں گی، جو مطلوب ہیں۔

حاتم اصم رَحِمَہُ اللّٰہُ کی نماز کی کیفیت

ایک بزرگ تھے حاتم اصم رَحِمَہُ اللّٰہُ، ان کے پاس ایک آدمی آیا اور آ کر کہنے لگا کہ حضرت! آپ ماشاء اللہ بہت اچھی نماز پڑھتے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ میں بھی آپ سے نماز پڑھنا سیکھوں، مجھے آپ بتائیے کہ آپ نماز کیسے پڑھتے ہیں؟ اس کی کیفیت بیان کیجیے؟ تو اس کے جواب میں حضرت حاتم اصم رَحِمَہُ اللّٰہُ نے کہا کہ جب میں نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہوں، تو اللہ کو حاضر وناظر جانتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اللہ میرے سامنے ہے اور یہ سمجھتا ہوں کہ میرے داہنی طرف جنت رکھی ہوئی ہے اور میرے بائیں طرف دوزخ رکھی ہوئی ہے اور یہ سمجھتا ہوں کہ میرے پیچھے شیطان

مجھے بہکانے کے لیے کھڑا ہے اور کہتے ہیں کہ جب نماز شروع کرتا ہوں، تو یہ سمجھ کر شروع کرتا ہوں کہ یہ میری آخری نماز ہے، اس کے بعد شاید مجھے موقعہ نہ ملے۔ اس طرح میں نماز پڑھتا ہوں۔

اس تصور کے ساتھ نماز پڑھیں گے، تو بتایئے کہ نماز میں کچھ مزا اور لطف آئے گا کہ نہیں آئے گا؟ ضرور آئے گا۔

وہی نہیں ہے، جس کے لیے نماز ہے!

بھائیو! اب تو ہماری نماز کا حال ایسا ہے کہ دماغ میں ساری گندگی بھری ہوئی ہے، ساری دنیا کی گندگی اس میں ہے، دنیا کی ناپائے دار چیزوں کی محبت، الفت، ساری گندگی و غلاظت کو لے کر اللہ کے دربار میں آ کر کھڑے ہو گئے ہیں، دور، دور تک خدا کا کوئی تصور نہیں، جو نماز اللہ ہی کے لیے ہے، اس نماز میں اللہ کے علاوہ سب کچھ ہے، وہی نہیں ہے، جس کے لیے نماز پڑھی جا رہی ہے۔

جیسا کہ علامہ اقبال رحمۃ اللہ نے فرمایا:

جو میں سر بہ سجدہ ہوا کبھی، تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں؟

آج ہماری نماز کا حال تو ایسا ہو گیا جیسے کہ نکاح کی مجلس میں نوشاہ نہ ہو، سارے باراتی جمع ہو گئے، وکیل، گواہ، باپ، بھائی، رشتہ دار سب ہیں اور قاضی صاحب بھی تشریف لا چکے ہیں؛ لیکن قاضی صاحب کس کا نکاح پڑھائیں؟ نوشاہ ہی نہیں ہے۔

بھائیو! ہماری نماز کا نوشاہ تو خدا ہے، وہی خدا جس کے لیے نماز ہے، اگر وہی نہ ہو، باقی سب چیزیں موجود ہوں، تو اندازہ کر لیجیے کہ اس نماز کی اللہ کے یہاں کیا

حیثیت ہوگی؟ اس وجہ سے سب چیزوں کو باہر نکالو؛ پھر اس کے بعد پاکیزہ دل کے ساتھ اللہ کے سامنے کھڑے ہو جاؤ۔

دینار دھور ہی ہوں-حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ایک بات یاد آگئی، میں نے حدیث کی کتابوں میں تو کہیں نہیں دیکھا؛ لیکن بعض بزرگوں کے ملفوظات میں پڑھا کہ ایک دفعہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کچھ درہم و دینار دھور ہی تھیں، تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، تو خلافِ معمول درہم و دینار کو دھوتا ہوا دیکھا، تو پوچھا کہ اے عائشہ! یہ کیا ہے؟ یہ درہم و دینار کو تم کیوں دھور ہی ہو؟ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا :یارسول اللہ! آپ سے میں نے سنا تھا کہ جب ہم کسی غریب سائل کو اللہ کے لیے کچھ دیتے ہیں، تو ہم سائل کو نہیں؛ بل کہ اللہ کو دیتے ہیں، بظاہر تو سائل کو دیتے ہیں؛ لیکن وہ حقیقت میں خدا کو دیتے ہیں، تو میں نے سوچا کہ جو چیز خدا کو دی جارہی ہے، اس میں میل ہو، تو اچھا نہیں لگتا؛ اس لیے میں اس کو دھور ہی ہوں۔

اس سے ہم کو اندازہ کرنا چاہیے کہ درہم و دینار ظاہراً تو سائل کو دیے جاتے ہیں، باطناً اللہ کو دیے جاتے ہیں؛ لیکن نماز تو ظاہراً و باطناً دونوں اللہ کو پہنچتی ہے، تو یہ کتنی پاک ہونی چاہیے؟ اسی لیے نماز کے لیے طہارت عظیم الشان شرط ہے، بغیر طہارت کے نماز کا تصور ہی نہیں، سب سے بڑی نماز کی شرط، جسے شرطِ اعظم کہہ لیجیے؛ وہ ہے "طہارت"، ظاہری طہارت بھی اور ظاہری طہارت کے ساتھ باطنی طہارت بھی، صرف ظاہری طہارت مراد نہیں، ظاہری طہارت کے ساتھ ساتھ باطنی بھی مراد ہے، جب دونوں طہارتوں کے ساتھ بندہ اللہ کے سامنے کھڑا ہو، تو وہ ہے اصلی نماز؛ اس لیے اپنے دماغ سے ساری گندی چیزوں کو باہر نکالو اور غلاظت کو باہر نکالو اور

بزبانِ حال اللہ سے یہ کہو کہ: ؎

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی

اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی

تکبیرِ تحریمہ کی حقیقت

بزرگو، دوستو!

جب نماز شروع کرتے ہیں، تو سب سے پہلے تکبیرِ تحریمہ یعنی " اَللّٰہُ أَکْبَر" کہا جاتا ہے۔ تکبیرِ تحریمہ شرطِ نماز ہے، اور خاص " اَللّٰہُ أَکْبَر" کا لفظ کہنا سنتِ مؤکدہ ہے اور اس کے ساتھ ہاتھ کانوں تک یا کندھوں تک اٹھانا بھی سنت ہے۔ سوچیے کہ یہ سب کیا ہے اور کیوں؟ یہ بات بہت واضح ہے کہ شریعت میں کوئی بات فضول یوں ہی مشروع نہیں ہوگئی؛ بل کہ اس کا کوئی مطلب ہوگا۔ علما نے لکھا ہے کہ اس " اَللّٰہُ أَکْبَر" کے کہنے اور اس کے ساتھ ہاتھ اٹھانے میں ایک رَمز و اشارہ ہے وہ کیا؟ وہ یہ کہ جب ہم ہاتھ اٹھاتے ہیں، تو غیر اللہ سے بڑائی کی نفی و انکار کی جانب اشارہ ہوتا ہے کہ کوئی بڑا نہیں، پھر ہم زبان سے " اَللّٰہُ أَکْبَر" کہہ کر اللہ کی بڑائی و کبریائی کا اقرار کرتے ہیں۔ تو اس کا حاصل یہ ہوا کہ یہ تکبیرِ تحریمہ دراصل دو چیزوں سے بنتی ہے، ایک لفظِ " اَللّٰہُ أَکْبَر" سے اور ایک ہاتھ اٹھانے سے اور دونوں کو ملائیں، تو یہ مطلب ہوتا ہے کہ کوئی بڑا نہیں؛ بل کہ صرف اللہ بڑا ہے؛ لہٰذا ہم اسی ایک بڑی و عظیم ذات کے سامنے نماز پڑھتے ہیں، اسی کی عبادت کرتے ہیں، اسی سے مدد مانگتے ہیں، اسی کو حاجت روا و مشکل کشا سمجھتے ہیں، وہی عبادت کے لائق ہے، وہی سجدے کے قابل ہے، وہی ہمارا خالق و مالک ہے۔ اگر اس احساس کے ساتھ تکبیر ہو رہی ہے، تو یہ حقیقی تکبیر ہے ورنہ صرف زبانی تکبیر ہے۔

علامہ ابن القیم رَحِمَهُ اللهُ بڑے عالم و محدث گزرے ہیں، انھوں نے لکھا ہے کہ اگر بندہ " اَللّٰهُ أَكْبَر " کہتے ہوئے اللہ کی جلالت و کبریائی کا تصور کرے اور اس کی زبان کے ساتھ اس کا دل بھی یہ کہے، تو اس کے دل میں اللہ ہر چیز سے بڑا ہوگا؛ لہٰذا اس کو اللہ کے سوا کوئی اور چیز نماز کے اندر اپنے میں مشغول نہیں کرے گی اور اگر اس کو کوئی اور چیز اللہ کی جانب سے توجہ ہٹا کر اپنے میں مشغول کر رہی ہے، تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے نزدیک اللہ سے بھی بڑی کوئی چیز ہے اور اس کا " اَللّٰهُ أَكْبَر" کہنا صرف زبانی زبانی ہے، دل کے ساتھ نہیں ہے۔ (أسرار الصلاۃ: ۹)

بعض صوفیا نے فرمایا کہ یہ ہاتھ اٹھانا اس بات کی جانب اشارے کے لیے مشروع ہے کہ آدمی نماز کے وقت سب کو اپنے پسِ پشت ڈال رہا ہے اور اللہ کی جانب متوجہ ہو رہا ہے، گویا یہ بتا رہا ہے کہ اب میرا کسی سے کوئی تعلق نہیں، سب کو میں نے چھوڑ دیا ہے۔ بس جب " اَللّٰهُ أَكْبَر" کہیں، تو اس کا دھیان جمائیں کہ اللہ بڑا ہے، اس کے سوا کوئی چیز بڑی نہیں اور سب چیزیں لات مارنے کے قابل ہیں؛ لہٰذا مجھے اسی کی جانب توجہ کر کے نماز پڑھنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ سورۂ فاتحہ کا جواب دیتے ہیں

جب نماز میں کھڑے ہوں اور آپ نے یہ تصور باندھ لیا ہو کہ اللہ دیکھ رہے ہیں، تو اب یہ بھی خیال کرو کہ میں جو پڑھ رہا ہوں، اللہ اس کو سن رہے ہیں اور میرا جواب بھی دے رہے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب بندہ نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھتا ہے، تو اللہ تعالیٰ ہر آیت کا جوب دیتے ہیں، جب بندہ کہتا ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ (تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، جو تمام عالموں کا پالنہار ہے) تو اللہ تعالیٰ اس کے

جواب میں کہتے ہیں"حمدني عبدي " (میرے بندے نے میری حمد بیان کی)اور جب بندہ کہتا ہے﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾(نہایت رحم کرنے والا، بڑا مہربان) تو اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں کہتے ہیں"أثنیٰ عليّ عبدي"(میرے بندے نے میری ستائش کی)اور جب بندہ کہتا ہے﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾(یومِ جزا کا مالک ہے) تو اللہ فرماتے ہیں"مجّدني عبدي"(میرے بندے نے میری عظمت و بڑائی اور بزرگی بیان کی ہے) پھر جب بندہ کہتا ہے﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾(اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں)اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ کہتے ہیں"فهذهٖ بيني وبين عبدي ولعبدي ماسأل "(یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور بندے کے لیے وہ ہے، جو اس نے مانگا)اس لیے کہ عبادت میرا حصہ ہے اور مدد جو میں کروں گا وہ میرے بندے کا حصہ ہے۔

پہلے تو اللہ کی حمد، اللہ کی تعریف و بزرگی بیان کرنے کے لیے کہا گیا ہے، پھر اس کے بعد اپنی عاجزی، تواضع اور اپنی ناتوانی کا اظہار کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔ اے اللہ! میں بندہ ہوں، تیرا غلام اور تیرا ہی محتاج ہوں؛ اس لیے اے اللہ! بندہ ہونے کی وجہ سے تیری ہی عبادت کرتا ہوں اور محتاج ہونے کے اعتبار سے تجھ ہی سے مدد طلب کرتا ہوں؛ یہ اللہ کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار ہے۔

پھر آگے بندہ کہتا ہے:﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴾

(اے اللہ! ہم کو سیدھے راستے پر چلا، ان لوگوں کے راستے پر چلا، جن لوگوں پر کہ تو نے انعام کیا ہے، ان لوگوں کے راستے پر نہ چلا، جن پر کہ غضب کیا گیا

ہے اور جو گمراہ قرار دیے گئے ہیں)

تو اس کے جواب میں اللہ کہتے ہیں "**فهو لاء لعبدي و لعبدي ما سأل**" یہ میرے بندے کے لیے ہے اور بندے نے جو مانگا اس کو وہ ملے گا۔

(**مسلم: ۹۰۴، السنن الکبریٰ نسائي: ۱/۱۹۷، ابوداؤد: ۹۱۱، ترمذي: ۲۹۵۳، ابن ماجه: ۳۷۸۴**)

اب اندازہ کیجیے کہ ہم نماز میں کھڑے ہو کر یہ تصور باندھ کر نماز پڑھیں گے، تو اِدھر اُدھر خیال جانے کا کیا مطلب؟ کوئی خیال اِدھر اُدھر نہیں جائے گا، غیر اختیاری طور پر جائے گا؛ لیکن قصداً آپ کی پوری توجہ اس جواب کی طرف ہو اور اس وقت آپ یہ سوچ سوچ کر نماز پڑھیں کہ میں یہ کہہ رہا ہوں، اللہ مجھے جواب میں یہ کہہ رہے ہیں، تو پھر اس نماز کی کیفیت و حلاوت ہی کچھ اور ہوگی۔

نماز مناجات کا نام ہے

لہٰذا یوں سمجھیے کہ نماز درحقیقت اللہ سے مناجات و سرگوشی کا نام ہے اور حدیث میں یہ بات صراحت کے ساتھ وارد ہوئی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "**إن أحدكم إذا صلى يناجي ربه**" (تم میں سے کوئی جب نماز پڑھتا ہے، تو وہ اپنے رب سے مناجات کرتا ہے)

(**البخاري: ۵۳۱**)

ایک اور حدیث میں ہے کہ وہ شخص کامل مومن نہیں، جو نماز میں نہ ہونے کی حالت میں غم میں نہ ہو، صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ یہ کس طرح یا رسول اللہ! تو فرمایا کہ "**لِأَنَّ الْمُصَلِّيْ يُنَاجِيْ رَبَّهُ وَإِذَا كَانَ فِيْ غَيْرِ صَلاةٍ إِنَّمَا يُنَاجِي ابْنَ آدَمَ**" (کیوں کہ نماز پڑھنے والا اپنے رب سے مناجات کرتا ہے اور جب وہ نماز میں نہیں

ہوتا، تو آدمیوں سے بات چیت کرتا ہے)   (معجم کبیر طبراني: ۱۱/۳۲)

الغرض! نماز اللہ تعالیٰ سے مناجات کا نام ہے اور اللہ تعالیٰ سے راز و نیاز کا موقعہ ہے؛ لہٰذا اس کا بہت خیال رکھنا چاہیے کہ ہم نماز میں اللہ سے مناجات میں مشغول ہیں، اس کے خلاف کوئی حرکت ہم سے صادر نہ ہو۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کا ایک واقعہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تنبیہ

ایک دفعہ یہ واقعہ پیش آیا کہ رمضان المبارک میں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم الگ الگ جماعتیں بنا کر مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک کونے میں مسجد کے، اعتکاف میں تھے، صحابہ جو قرأت کر رہے تھے اس میں ان کی آواز ایک دوسرے پر بلند ہوگئی، آپ نے اس کو دیکھا، تو فرمایا کہ مصلی تو اللہ سے مناجات کرتا ہے؛ لہٰذا ایک دوسرے پر آواز بلند نہ کرو۔

(اتحاف الخیرۃ: ۲/۷۳)

دیکھیے! اس واقعے میں عبرت ہے کہ نماز میں کس طرح اس کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ مناجات کے خلاف کوئی بات نہ ہو۔

کیا اللہ کی آواز سنائی نہیں دیتی؟ - حضرت مدنی رحمہ اللہ کا واقعہ

ہوسکتا ہے کہ بعض لوگوں کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ اللہ کا یہ جواب ہمیں تو سنائی نہیں دیتا، پھر جواب دینے کا فائدہ کیا ہوا؟

میں کہتا ہوں کہ کیوں سنائی نہیں دیتا؟ ارے! سنائی تو دے رہا ہے، ابھی آپ نے سنا کہ نہیں سنا کہ اللہ کہتے ہیں "حمدني عبدي" یہ سنانے والے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ان کو سنانے والے جبرئیل علیہ السلام ہیں اور جبرئیل علیہ السلام

کوسنانے والے اللہ رب العزت ہیں، جب اللہ تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو سنایا اور جبرئیل علیہ السلام نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ہم آپ کو سنا رہے ہیں، یہ اللہ ہی کی تو آواز ہے؟ تو پھر کیوں کہتے ہیں کہ آواز نہیں آرہی ہے؟ آواز تو آرہی ہے، ہاں! اتنی بات ہے کہ بلاواسطہ نہیں؛ بل کہ بالواسطہ آرہی ہے۔

مجھے اس پر ایک قصہ یاد آ گیا۔ ایک دفعہ دارالعلوم دیوبند میں حضرت شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کا درسِ حدیث ہو رہا تھا، آپ مسندِ درس پر بیٹھے ہوئے ہیں، ایک طالب علم نے حدیث پڑھی، جس کے اندر آتا ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آخری زمانے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے اور فلاں فلاں کام کریں گے، کئی کام ان کے اس حدیث میں بتائے گئے ہیں، اس میں یہ بات بھی بتائی گئی ہے کہ جس وقت وہ تشریف لائیں گے تو "یضع الجزیة" (جزیہ جس کو ٹیکس tax کہتے ہیں، اسے وہ ختم کر دیں گے)۔ (البخاری: ۱/۲۹۶، المسلم: ۱/۸۷)

دیکھیے! اس حدیث کے اندر آیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جزیے کو ختم کر دیں گے۔ جب یہ حدیث پڑھی گئی، تو حضرت شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے اسے بیان فرمایا اور تشریح کی، تو ایک طالبِ علم کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت! یہ حدیث میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے؛ اس لیے کہ حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ جزیے کو منسوخ کر دیں گے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیسے منسوخ کر دیں گے؟

تو حضرت شیخ الاسلام رحمہ اللہ کہنے لگے کون کہتا ہے؟ طالب علم کہنے لگے کہ حضرت جو حدیث پڑھی گئی اسی میں تو آیا ہے، حضرت پھر کہنے لگے کہ ارے کون

کہتا ہے وہ منسوخ کردیں گے؟ وہ طالبِ علم پھر کہنے لگے، حضرت! حدیث میں تو ہے، پھر کہنے لگے ارے کون کہتا ہے؟ محمد صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ہی تو کہتے ہیں؟

اس کا مطلب یہ ہوا کہ محمد صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خود منسوخ کرنے والے ہیں، عیسیٰ عَلَيْهِ السَّلَام کہاں منسوخ کرنے والے ہیں؟ عیسیٰ عَلَيْهِ السَّلَام کا جب وقت آئے گا، ان کا زمانہ آئے گا، تب ان کے زمانے میں منسوخ ہوگا؛ لیکن منسوخ کرنے والے محمد صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ہی ہیں۔

تو بھائی اسی طریقے پر میں نے کہا کہ آپ کو کیوں سنائی نہیں دیتا؟ ہاں! البتہ اللہ کی آواز ڈائریکٹ ہم تک، آپ تک نہیں پہنچے گی؛ بل کہ محمد صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی آواز میں ہم تک اور آپ تک یہ پہنچے گی اور پہنچ رہی ہے؛ اس لیے کہ اللہ کی آواز براہِ راست سننے کے لیے ہمارے اور آپ کے پاس وہ کان ہی کہاں ہیں؟ اگر ہم کو براہِ راست خدا کی آواز آتی تو سینہ پھٹ جاتا۔

اس لیے اللہ نے ایسا کیا کہ اللہ کے نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے سینے میں اُتار کر اس آواز کو پھر ہم تک پہنچایا، اس پہنچانے میں جمال پیدا ہو گیا، تو خدا کے جلال کو محمد صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے جمال میں ڈھال کر ہم تک پہنچایا، تو ہم کو سہارا مل گیا۔

نماز میں قرآن کا حق ادا کریں

اس کے بعد نماز میں جب قرآن کریم پڑھیں، تو آیتوں کو غور سے سنیں اور ان کے معانی پر غور کرتے رہیں اور ان آیات کے جوابات کا تصور کرتے ہوئے نماز پڑھیں، یہ ہے قرأت کا حق۔

ایک تابعی حضرت مسلم بن مخراق رَحِمَهُ اللهُ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا سے پوچھا کہ ہمارے یہاں کچھ لوگ ہیں، جو ایک رات میں دو دو، تین

تین مرتبہ قرآن پاک ختم کر لیتے ہیں۔ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ ان لوگوں نے پڑھا تو ہے؛ مگر حقیقت میں نہیں پڑھا ہے ۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رات بھر نماز پڑھی ہے آپ کسی بھی امید والی آیت سے گزرتے، تو اللہ سے سوال کرتے اور مانگتے اور کسی بھی خوف کی آیت سے گزرتے، تو اپنے رب سے اس سے پناہ مانگتے۔ (اتحاف الخیرۃ: ۱۶۹۲)

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت نماز کے لئے کھڑے ہوئے، میں بھی جا کر کھڑا ہوگیا، اللہ کے نبی نے سورۃ البقرۃ پڑھی؛ پھر سورۂ آل عمران؛ پھر سورۂ نساء پڑھی، آپ پڑھتے جاتے تھے اور جہاں آیتِ رحمت آتی تھی ، وہاں رک جاتے تھے اور اللہ سے سوال کرتے تھے، اے اللہ! مجھے بھی تیری رحمت عطا کردے اور جہاں پر کوئی عذاب کا ذکر آجاتا تھا، وہاں اللہ سے پناہ مانگتے اور التجا کرتے کہ اے اللہ! مجھے تیرے عذاب سے بچالے۔ (سنن کبریٰ نسائي: ۱۰/۳، سنن نسائي مجتبیٰ: ۱۰۰۹، ابو داؤد: ۱۲۷، صحیح ابن خزیمة: ۲۸۴)

اسی طرح ایک حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ تشریف لائے، حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم بیٹھے ہوئے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے "سورۃ الرحمٰن" کی تلاوت فرمائی، وہ "سورۃ الرحمٰن" جس کے اندر بار بار یہ آیت دہرائی گئی ہے ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ (اے جن وانس! تم اللہ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟)

اللہ تعالی نے اپنی نعمتوں کا ذکر کیا ہے اور یہ آیت دہرائی ہے ، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سورت کی تلاوت فرمائی اور حضراتِ صحابہ خاموش بیٹھے

ہوئے تھے ،تلاوت کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا کہ "لیلۃالجن "میں میں نے جنات کے گروہ میں بھی یہی سورت پڑھ کرسنائی تھی تو"فَكَانُوْا أَحْسَنَ مَرْدُوْداً مِنْكُمْ "(قرآن کو سمجھ کر قرآن کا جواب دینے میں وہ تم سے اچھے تھے)اس کے بعد فرمایا: "جب میں یہ آیت پڑھتا تھا ، تو وہ جواب میں کہا کرتے تھے:"لَا بِشَيْءٍ مِنْ نِعَمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ"(اے ہمارے پروردگار! ہم تیری کسی نعمت کو نہیں جھٹلائیں گے، تیرے ہی لیے تعریف ہے)

(الترمذي: ۲/۱۶۴، حديث : ۳۲۹۱)

حضور ﷺ نے فرمایا: "جواب ایسا ہونا چاہیے"۔ یہ ہے قرأت کا حق ، جب قرأت کا حق ادا کرتے ہوئے نماز پڑھیں گے،تو انشاءاللہ نماز کے اندر لطف ومزہ بھی آئے گا اور اسی کے ساتھ اس کے اندر جان وروح بھی پڑ جائے گی؛ لیکن قرأت کا حق وہ ادا کرسکتا ہے، جو قرأت کرنے پر سمجھتا بھی ہو کہ کیا پڑھا جا رہا ہے؛ لیکن بہت سارے لوگ وہ ہیں، جو عربی زبان نہیں جانتے ، یہ زبان ہماری اُخروی زبان ہے، اللہ اور اس کے فرشتوں کی زبان ہے؛ اس لیے ہم سب لوگوں کو چاہیے کہ عربی زبان سیکھنے کی کوشش کریں یا کم از کم ترجمہ جان لیں۔

رکوع میں کیا تصور ہونا چاہیے؟

بھائیو! نماز میں آگے بڑھتے ہوئے ہم رکوع کی طرف جاتے ہیں ، اللہ کے سامنے جھکنا بہت بڑی عبادت ہے ، اللہ کو بہت پسند ہے کہ بندہ ، بندہ بن کر رہے ، اگر بندہ، "بندہ" نہیں بنتا، تو خدا کی نظر میں بہت "گندہ" ہوتا ہے، رکوع میں جا کر یہ تصوّر کرے کہ میں جُھک رہا ہوں ، میں ذلیل ہوں اور میرا رب بلند ہے، میں اس کے سامنے پست ہوں، ذلیل ہوں۔

یہاں ایک بات خاص طور سے قابلِ غور یہ ہے کہ جب رکوع سے اٹھتے ہیں، تو "سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ" (اللہ نے سن لی اس بندے کی، جس نے اس کی تعریف کی) کہتے ہیں، اب جب اٹھتے ہوئے آپ کی زبان پر یہ الفاظ ہوں، تو سوچیں کہ اس میں کیا کہا جا رہا ہے؟ اللہ کہہ رہے ہیں کہ میں نے سن لی بندے کی، تو میری بھی سن لی ہے، میری آواز کتنی گھٹیا، کیسے گنہگار کی آواز ہے، مجھ جیسے حقیر وفقیر کی آواز اتنے بڑے خالق و مالک کے دربار میں پہنچ گئی ہے؟

اگر کسی کو یہ کہا جائے کہ بھائی! تمھارا جو پیغام ہے، وہ آج وزیرِ اعظم تک پہنچ چکا ہے اور انھوں نے اسے پڑھ لیا ہے۔ اب بتاؤ کہ سننے والے کو کس قدر اپنی بڑائی کا بھی احساس ہوگا اور اسے مزہ ولطف بھی آئے گا؟ یہاں بھی یہی کہا جا رہا ہے کہ اے بندے! تو نے جو بھی وظائف نماز کی حالت میں پڑھے تھے، وہ سب اللہ نے سن لیا ہے۔

جب یہ سوچیں گے، تو مزہ آئے گا کہ نہیں آئے گا؟ اگر اب بھی نہ آئے، تو کب آئے گا؟ اور یہ تو بہت ہی مزے کی بات ہے، اس سے زیادہ مزے اور لطف کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ ہم کو بتایا جا رہا ہے کہ تیری یہ آواز خدا کے دربار میں پہنچائی جا رہی ہے۔

بندہ خدا کے قدموں میں!!

رکوع کے بعد سجدہ ہوتا ہے اور سجدہ سب سے بڑی عبادت ہے اور مسجد اسی لفظ سے ماخوذ ہے۔ مسجد کے معنے ہیں، "سجدہ گاہ" حالاں کہ نماز میں رکوع اور قیام، قرأت، جلسہ وغیرہ بھی ہوتے ہیں؛ اس لیے مسجد کو "مَرْکَعْ" (رکوع کی جگہ) یا "مقام" (قیام کی جگہ) یا "مَقْرَأ" (پڑھنے کی جگہ) بھی کہا جا سکتا تھا؛ لیکن اس کے باوجود اس کے لیے لفظِ "مسجد" استعمال کیا جاتا ہے، یعنی سجدہ گاہ؛ اس لیے کہ

سجدہ سب سے بڑی عبادت ہے۔

سب سے بڑی عبادت بجالاتے ہوئے، آدمی جب سجدے میں جاتا ہے، تو حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "**أقرب ما يكون العبد من ربه وهو ساجد فأكثروا الدعاء**" (بندہ جب سجدے میں ہوتا ہے، تو اس وقت اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے؛ لہٰذا تم سجدے میں کثرت سے دعامانگو) (المسلم: ۱/ ۱۹۱، ابوداؤد: ۱۲۷)

اور ایک روایت کے اندر آتا ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "**الساجد يسجد علىٰ قدمي اللّٰه تعالىٰ فليسئل وليرغب**" (بندہ جب سجدہ کرتا ہے، تو دراصل وہ سجدہ اللہ کے قدموں پر کرتا ہے؛ لہٰذا جو بھی حاجتیں ہوں، اس کا اللہ سے سوال کرے اور اللہ کی طرف رغبت پیدا کرے)

(مسلم: ۴۸۲، مسند ابو یعلی: ۶۶۵۸، مسند ابو عوانہ: ۱۴۷۱، مسند احمد: ۹۴۴۲)

سوچنے کی بات ہے کہ سجدہ کس قدر عظیم عبادت ہے کہ آدمی اس میں اللہ کے قدموں پر ہوتا ہے؛ اگر سجدے میں جا کر اللہ کے قدموں میں سر رکھ کر، پھر بھی اس کا دل دنیا میں لگا ہوا ہو، تو بتاؤ! اس سے زیادہ محروم کون ہوگا؟ پہنچ گیا وہ خدا کے دربار میں؛ لیکن پھر بھی دل دنیا میں اٹکا ہوا ہو، اس سے بڑا محروم کوئی نہیں، ایسا سجدہ کریں، گویا کہ والہانہ اور عاشقانہ سجدہ ہو، اللہ کے دربار میں سر رکھتے ہوئے یہ سمجھے کہ بس میں تو اللہ سے مل گیا ہوں۔

سجدے کی ایک ظاہری برکت

یہ تو سجدے کی روحانی برکت ہے، ایک برکت اس کی ظاہری سنتے چلیے کہ "حضرت اقدس مولانا ذوالفقار صاحب نقشبندی دامت برکاتہم" نے لکھا ہے کہ

جب حضرت آدم علیہ السلام نے ایک خطا کا ارتکاب کیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا میں بھیج دیا؛ تو حضرت آدم علیہ السلام سجدے میں پڑ گئے اور روتے رہے، روتے رہے، اللہ تعالیٰ کو وہ سجدہ بڑا محبوب و پسند آیا، بھوکے بھی تھے، کئی دن سے، جنت میں تو لذیذ، لذیذ غذائیں ملا کرتی تھیں؛ لیکن یہاں دنیا میں آئے، تو اللہ کے دربار میں روتے پڑے ہیں، کھانے تک کا احساس نہیں، اللہ تعالیٰ نے کئی دن کے بعد ان کو اُٹھایا اور کھانا ان کے منھ میں ڈالا گیا کہ اے آدم! تم نے سر جھکایا، تو ہم تمھارے لیے کھانا اوپر اٹھاتے ہیں۔

حضرت فرماتے ہیں کہ اسی لیے انسان کے کھانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کا سر سیدھا ہوتا ہے، کھانا نیچے سے اٹھا کر اوپر کو لاتا ہے؛ لیکن جتنے جانور ہیں، وہ سب سر نیچے کر کے کھانے کی طرف منھ لے جا کر کھانا کھاتے ہیں؛ اس لیے کہ اللہ کہتے ہیں کہ اے میرے بندے! تو نے میرے لیے سر جھکایا، تو میں کھانے کے لیے تیرا سر جھکنے نہیں دیتا، کھانا تیرے پاس آئے گا، تو کھانے کے پاس نہیں جائے گا۔

یہ اللہ کی عنایت ہے اور بندگی کا ثمرہ ہے۔ بہ ہر حال! یہ ہے وہ سجدہ جس کی وجہ سے انسان اللہ کے انتہائی قریب ہو جاتا ہے۔

اللہ نے پیار کر لیا!!

سجدے کی لذت کا حال عاشقوں سے پوچھو، ہمارے بزرگوں میں "حضرت مولانا فضلِ رحمان گنج مرادابادی رحمہ اللہ" نقشبندی سلسلے کے بڑے اولیاء اللہ میں سے گزرے ہیں، ایک بار "حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ" اپنی جوانی میں ان کی خدمت میں ملاقات کے لیے گئے، تو حضرت مولانا فضل رحمان صاحب رحمہ اللہ نے ان سے فرمایا کہ "بیٹا! تم سے ایک بات کہتا ہوں: "میں جب

سجدے میں جاتا ہوں، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ میاں نے گود اٹھا کر پیار کرلیا"۔ اللہ اکبر!!!

اس میں گود سے مراد یہ عرفی گود نہیں اور نہ پیار سے مراد بوسہ ہے؛ بل کہ اس سے مراد اللہ کا قرب ہے اور اس کی محبت وشفقت اور اس میں انھوں نے اس حالت کی لذت ومستی اور کیف کا ذکر کیا ہے۔ اب اندازہ کیجیے کہ جس شخص کو سجدے میں یہ کیف محسوس ہوتا ہو اس کے سجدے کی کیا کیفیت ہوگی، جب سجدہ ایسا، تو اس کا کیف بھی ایسا۔

سجدے سے سر کیسے اٹھاؤں؟

ایک بزرگ سے پوچھا گیا کہ آپ بہت لمبا سجدہ کرتے ہیں، کیا بات ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ میں اس لیے لمبا، لمبا سجدہ کرتا ہوں کہ حدیث میں آیا ہے کہ بندہ جب سجدے میں گرتا ہے، تو وہ خدا کے قدموں پر سر رکھتا ہے، اب بتاؤ کہ خدا کے قدموں پر سر رکھ کر پھر سر کیسے اٹھالوں؟ کیا یہ سر اٹھانا مناسب ہے؟ ظاہر بات ہے، اللہ کے دربار میں سر رکھ دیا اور قرب کی آخری منزل میسر آگئی، تو اب سر کیسے اٹھاؤں؟

الغرض! ہمارا سجدہ بھی اس احساس وجذبے کے ساتھ ہونا چاہیے کہ ہم اللہ کے قریب ہو چکے ہیں اور اس کے قدموں پر سر رکھے ہوئے ہیں۔

"خلوص" و "خشوع" حقیقتِ نماز

اب آخر میں ایک اور اہم پہلو کی جانب توجہ کیجیے!

وہ یہ کہ نماز میں بھی اور دیگر عبادات میں بھی خلوص وللّٰہیت اور خشوع بہت ضروری ہے اور یوں کہا جائے، تو بالکل صحیح ہے کہ یہی درحقیقت نماز کی روح وجان ہیں؛ لہٰذا ان کا بہت اہتمام کرنا چاہیے۔ جہاں تک خلوص وللّٰہیت کی بات ہے یہ

سب جانتے ہیں کہ یہ کس قدر اہم وضروری ہے؟ بڑی معروف حدیث ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ " إنما الأعمال بالنيات" (اعمال کا دارو مَدار نیتوں پر ہے)

اور رہا خشوع کا مسئلہ، تو ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی اس طرح نماز پڑھتا ہے کہ اس میں خشوع کا، خضوع کا مکمل دھیان رکھتا ہے، رکوع وسجدہ نہایت اطمنان سے ادا کرتا ہے، تو یہ نماز اللہ کے دربار میں نہایت روشن وسفید ہو کر جاتی ہے اور جب اللہ کے دربار میں جاتی ہے، تو اس کو یوں دعا دیتے ہوئے جاتی ہے کہ " حفظك الله كما حفظتني" (اللہ تیری حفاظت کرے، جیسے کہ تو نے میری حفاظت کی) اور اگر کوئی بندہ نماز کو بے ڈھنگے طریقے پر ادا کرے اور خشوع وخضوع کو ضائع کرتا ہے اور رکوع وسجدے کو ٹھیک ادا نہیں کرتا، تو وہ نماز بندے کے پاس سے کالی شکل میں جاتی ہے اور یہ کہتی ہے "ضيّعك الله كما ضيّعتني" (تجھے بھی اللہ غارت کرے، جیسے تو نے مجھے ضائع کیا) پھر اس نماز کو ایک پرانے کپڑے میں لپیٹ کر، اس کے منہ پر ماردی جاتی ہے۔

(معجم كبير طبراني: ٣٢١٣، شعب الإيمان: ٧/ ١٤١، كنز العمال: ١٩٠٥٢)

اس حدیث کے بارے میں محدثین نے لکھا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے اور یہ کئی الفاظ کے ساتھ حدیث کی کتابوں میں درج کی گئی ہے۔

ان سب احادیث میں نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے امت کو یہی تعلیم دی ہے کہ نماز کو نماز بنائیں؛ کیوں کہ کچھ اُٹھک بیٹھک کر لینے کا نام نماز نہیں ہے، نماز تو ایک اہم ترین عبادت ہے، جس کو صحیح طریقے پر ادا کرنا چاہیے۔

کیا اللہ کو ہماری نماز کی حالت کا علم نہیں؟

کیوں کہ اللہ ہماری نماز کو، نماز کے ہر رُکن وعمل کو دیکھتے ہیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ آخری صف میں نماز پڑھ رہے تھے، جب نماز ختم ہوئی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابی کو بلاکر بڑے تیز وتُند لہجے میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا: " ألاتتّقی اللہ ؟ ألا تریٰ کیف تصلیّ؟" (کیا تجھے اللہ کا ڈر نہیں ہے؟ کیا دیکھتا نہیں کہ تو نماز کیسے پڑھ رہا تھا؟) پھر فرمایا کہ یہ نہ سمجھو کہ مجھے تم لوگوں کے حالات کا علم نہیں ہوتا، تمھاری ہر ہر چیز میرے سامنے آشکارا ہوتی ہے۔ (مسند أحمد: ۱۰۰۴۹)

اور یہ مضمون ایک نہیں کئی حدیثوں سے ثابت ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے پیچھے جو نماز پڑھتے ہیں، ان کی ساری کیفیت میرے سامنے آشکارا ہوتی ہے، کوئی چیز مخفی نہیں ہوتی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیچھے والوں کو بھی سامنے والوں کی طرح دیکھ لیتے تھے۔ اس میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ پیچھے نماز پڑھنے والوں کی نماز کی کیفیات اور حالات کا علم جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو رہا ہے، تو بھائیو! کیا اللہ کو علم نہیں ہوگا؟ جب کہ وہ خدا تو "علام الغیوب" ہے، دلوں میں چھپے اَسرار کو جاننے والا ہے، کیا اسے ہماری نماز کی خبر نہیں ہوگی؟ ضرور ہوگی۔ اگر یہ ایک بات ہماری سمجھ میں آجائے، تو ہماری نمازیں درست ہو جائیں۔

یہ چند اہم اشارات ارکان واعمالِ نماز کے بارے میں ہیں، جن کی جانب اگر توجہ دی جائے، تو ممکن ہے کہ ہماری نماز میں نکھار وسدھار پیدا ہو جائے اور نماز نماز بن جائے۔ کسی نے بہت خوب کہا ہے کہ ؎

نشانِ سجود تیری جبیں پر ہو تو کیا؟
کوئی ایسا سجدہ کر کہ زمیں پر نشاں رہے

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری نمازوں کو واقعی نماز بنا دے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

بیعت کیا
اور کیوں؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بیعت کیا اور کیوں؟

الحمد للہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ . أما بعد

فقد قال اللہ تعالی فی القرآن الکریم

أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ، بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ﴾

(لوگوں میں بعض وہ ہیں، جو اپنے آپ کو بیچ دیتے ہیں اللہ کی رضا تلاش کرتے ہوئے اور اللہ کی ذات بندوں پر بڑی رحیم، کریم ہے) (البقرۃ:۲۰۷)

محترم بھائیو!

آج ایک بات دیکھنے کو ملتی ہے، وہ یہ کہ انسان نے اپنی ذات کو دنیا کی ہر چیز کی لیے بیچنا شروع کر دیا اور ذات ہی کو نہیں، اپنے ایمان کو بھی بیچنا شروع کر دیا ہے ۔دنیا حالاں کہ بہت حقیر و ذلیل ہے؛ مگر انسان اس حقیر و ذلیل دنیا کے لیے خود اپنی ذات کو بھی بیچ دیتا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنے ایمان کو بھی بیچ دیتا ہے۔

بے ایمانی کا فتنہ

اور آج کے دور میں وہ حدیث پورے طور پر نہ سہی ،ایک حد تک تو ابھی صادق آتی دکھائی دیتی ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:" يُصْبِحُ الرَّجُلُ مُؤْمِناً وَّ يُمْسِيْ كَافِراً وَّ يُمْسِيْ مُؤْمِناً وَّ يُصْبِحُ كَافِراً "یعنی ایک

زمانہ ایسا آئے گا کہ آدمی صبح مومن ہوگا، تو شام کو کافر اور شام میں مومن ہوگا، تو صبح کافر؛ اس کے بعد فرمایا: ایسا کیوں ہوگا؟ فرماتے ہیں کہ ”يَبِيْعُ دِيْنَهُ بِعَرَضٍ مِنَ الدُّنْيَا قَلِيْلٍ “(یہ اپنے دین وایمان کو دنیا کے معمولی وحقیر سامان کے عوض بیچ دیگا) اس طرح صبح کا مومن شام کو کافر اور شام کا مومن صبح کو کافر ہو جائے گا۔

(المسلم: ۱/۷۵)

جان کے لیے ڈاڑھی دے دی

ایک صاحب میرے پاس آیا کرتے تھے اور ان کے ماشاء اللہ اچھی خاصی ڈاڑھی بھی تھی ، وہ ایک نیم سماجی ونیم سیاسی جماعت سے وابستہ ہو گئے ، ایک بار میرے پاس آئے، تو ان کی ڈاڑھی چھوٹی ہوگئی تھی ، میں نے پوچھا کہ ڈاڑھی کو کیا ہوا؟ تو کہنے لگے کہ ہمیں اس جماعت کی جانب سے مختلف جگہ جانا آنا پڑتا ہے اور غیر قوموں سے بھی واسطہ پڑتا ہے؛ لہٰذا کچھ جان کا خطرہ رہتا ہے؛ اس لیے ڈاڑھی کو چھوٹا کرلیا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کی جماعت میں اور ہم میں یہی فرق ہے کہ آپ جان کی خاطر ڈاڑھی دے دیتے ہیں اور ہم ڈاڑھی کی خاطر جان دے دیتے ہیں؛ یہ ہے آج کا حال!!!

خود کو اللہ کے لیے بیچ دو

ان حالات میں جب کہ لوگ جان کی خاطر ایمان وخدا کی مرضیات کو بیچ رہے ہیں، ہمارے سامنے قرآن نے ایک دعوت رکھی ہے، وہ یہ کہ تم اللہ کی مرضیات پر اپنے نفس وجان کو بیچ ڈالو، یہ نہیں کہ اللہ کی مرضی کو اپنی جان کی خاطر بیچو۔ اس وقت جو آیت میں نے آپ کے سامنے پڑھی ہے، اس میں یہی بات بیان کی گئی ہے؛

چناں چہ فرمایا کہ ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌم بِالْعِبَادِ﴾ لوگوں میں بعض وہ ہیں، جو اپنے آپ کو بیچ دیتے ہیں، اللہ کی رضا تلاش کرتے ہوئے اور اللہ کی ذات بندوں پر بڑی رحیم، کریم ہے)

خبر میں پیغام و دعوت

بظاہر اس آیت کے اندر ایک خبر دی گئی ہے کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی مرضی تلاش کرتے ہوئے اپنے نفس کو بیچ ڈالتے ہیں ۔ یہ ایک خبر ہے؛ لیکن قرآن کا ایک عجیب اصول و طریقہ ہے، وہ یہ کہ وہ خبر تو پیش کرتا ہے؛ لیکن خود خبر مقصود نہیں ہوتی؛ بل کہ وہ خبر کے ذریعے ایک دعوت دینا چاہتا ہے، ایک پیغام دینا چاہتا ہے، ایک حکم دینا چاہتا ہے؛ اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ ہر خبر کے پیچھے ایک اِنشاء ضرور ہوتی ہے اور یہ صرف قرآن کے ساتھ خاص نہیں، یہ بلاغت کا قاعدہ ہے، جس کا بھی کلام بلیغ ہو اور وہ بلاغت کا حامل انسان جب کوئی خبر پیش کرتا ہے، تو اس کے پیچھے ضرور کوئی انشاء اور دعوت موجود ہوتی ہے۔

اور قرآن تو سب سے زیادہ بلیغ کلام ہے؛ لہٰذا قرآن مجید میں بھی جو خبر (Report) آئے گی اس کے پیچھے کوئی دعوت و پیغام (Message) مقصود ہوگا؛ لہٰذا اس آیت میں بھی ایک خبر ہے، تو اس کے پیچھے بھی اللہ کا یہ مَنشا ہے کہ بندوں کو وہ یہ دعوت دینا چاہتے ہیں کہ اے میرے بندو! تم کو بھی اپنے آپ کو ان لوگوں کی طرح بنانا چاہیے، جن کی خبر میں تم کو سنا رہا ہوں؛ لہٰذا تم بھی اللہ کے لیے اپنے نفسوں کو بیچ دو۔

آیت کا شانِ نزول

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں نازل

ہوئی ہے، ان میں متعدد صحابہ کے نام ذکر کیے گئے ہیں، ''حضرت صہیب بن سنان رومی رضی اللہ عنہ کا ذکر بھی آتا ہے کہ جب انھوں نے ہجرت کا ارادہ کیا اور اس ارادے سے نکلے، تو کافروں نے ان کو ایک جگہ پر گھراؤ میں لے لیا، کہنے لگے: صہیب! تم روم کے آدمی ہو، مکے کے نہیں، تم مکے میں آئے تھے، تو تمھارے جسم پر کپڑا بھی نہیں تھا، جیب میں ایک پائی بھی نہیں تھی، تم مکہ آئے، یہاں آ کر تم نے کمایا اور جمع کیا۔ اب اس کو پونجی بنا کر یہاں سے لے جانا چاہتے ہو؟ یہاں کی ایک پائی ہم باہر جانے نہیں دیں گے، اگر تم کو جانا ہو، تو تم تنہا جاؤ گے، تمھارے ساتھ کوئی چیز نہیں جائے گی۔

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے پہلے ان کو دھمکی دی اور کہا: میرے ترکش میں تیر بھرے ہوئے ہیں اور میں بہت بڑا تیر انداز ہوں، تم لوگ مجھے جانتے ہو، اگر تم لوگ میرے قریب آئے، تو تیروں کی بوچھار کردوں گا اور اتنے تیر برساؤں گا کہ تم میں سے کوئی باقی نہیں رہے گا، اس پر وہ لوگ سہم گئے؛ اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ یہ بہت بڑے تیر انداز ہیں؛ لیکن دور ہی کھڑے رہے، جانے کا راستہ نہیں دے رہے تھے۔

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے کہا: میرا بہت سامال میں اپنے ساتھ نہیں لے جا رہا ہوں، جو مکے میں چھوڑ دیا ہے، فلاں فلاں جگہ پر میں نے جمع کر کے رکھ دیا ہے، میں تمھیں اجازت دیتا ہوں کہ تم سب وہ سارا مال لے لو، بس یہ سن کر سارے کافر وہاں سے چلے گئے اور واقعتاً انھوں نے مال چھوڑا بھی تھا؛ چناں چہ کفار و مشرکین اسے لینے چلے گئے اور حضرت صہیب رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ طیبہ پہنچ گئے، اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (تفسیر القرطبی: ۲۰/۳)

بعض روایات میں کچھ اور صحابۂ کرام ﷺ کے نام ہیں کہ ان کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی، مختلف نام ذکر کیے گئے ہیں۔ بہ ہر حال! مختلف صحابہ ﷺ کے حالات پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی اور نقشہ کھینچا کہ یہ لوگ ایسے لوگ ہیں، جنھوں نے اللہ کے نام پر اپنی جان و مال کو بیچ دیا اور اپنے مال و جان کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

لفظِ ”شَریٰ“ کی تحقیق اور آیت کا خلاصہ

اس آیت میں ایک لفظ ”یَشْرِیْ“ آیا ہے، یہ ”شَریٰ یشري“ سے بنایا گیا ہے، اس کے عربی میں دو معنے آتے ہیں: ”بیچنے“ کے بھی آتے ہیں، ”خریدنے“ کے بھی آتے ہیں، بعض لوگوں نے یہاں خریدنے اور بعض لوگوں نے بیچنے کے معنے لیے ہیں، جمہور نے اسے بیچنے کے معنے میں لیا ہے اور خریدنے کے معنے میں بھی آنے کی تائید ایک آیت سے ہوتی ہے۔

چناں چہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾

(بیشک اللہ نے مسلمانوں کے جانوں اور مالوں کو ان سے خرید لیا، اس بات کے عوض میں کہ انہیں جنت دے گا) (التوبة: ۱۱۱)

اس آیت میں ”اشتری“ خریدنے کے معنے میں لیا گیا ہے اور اس آیت میں بھی وہی مضمون ہے، جو پہلی آیت میں ہے؛ لہٰذا دونوں آیتوں کا خلاصہ اور مطلب یہ ہوا کہ بندہ اللہ کی مرضی تلاش کرتے ہوئے اپنے نفس کو بیچ دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو بندے سے خرید لیتے ہیں۔

علما نے لکھا ہے کہ یہ اللہ کے لیے اپنے نفس کو بیچ دینا کیا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ

نفس ہماری ملکیت نہیں، نفس کو پیدا کرنے والا، یعنی ہماری ذات کو بنانے والا اللہ ہے، اللہ خود اس کا مالک ہے، ہمارے پاس تو محض امانت کے طور پر ہے؛ لیکن اس کے باوجود اللہ کی رحمت پر قربان جایئے کہ اللہ تعالیٰ یہ نفس بنا کر ہمیں گویا مالک بنا دیا ہے کہ تم اب اس کے مالک ہو اور تم اس میں تصرف کرنے کے مجاز ہو۔ پھر اس کے بعد کہا کہ تمھاری یہ چیز مجھے بیچ دو، میں اس کا خریدار ہوں اور میں اس کے بدلے میں تمھیں جنت عطا کروں گا۔

اندازہ کیجیے کہ کتنی بڑی اللہ کی رحمت ہے کہ اپنی مملوک چیز کو اولاً ہماری کہہ کر ہماری نفسیاتی اُلجھن کو دور کر دیا؛ حالاں کہ ہم اس کے مالک نہیں؛ بل کہ خود اللہ ہی اس کے مالک ہیں، پھر اس کو ہم سے خرید کر اس کے بدلے میں جنت کا وعدہ فرمایا، اپنی ہی چیز ہم سے لے کر اس پر جنت عطا کرنا کیا عین رحمت و کرم نہیں ہے؟

اس کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک باپ اپنے بچے کو دو روپے دیتا ہے، اس کے بعد دوسرے دن اس کو کہتا ہے کہ بیٹا! تمھارے وہ دو روپے تم ہم کو دے دو، تو دس روپے ہم تم کو دیتے ہیں۔ اب وہ دو روپے، جو پہلے سے بیٹے کے پاس تھے، وہ کس کے ہیں؟ باپ ہی کے تو ہیں، اب وہی باپ مزید دینا چاہتا ہے، تو یوں کہتا ہے کہ وہ دو روپے ہم کو دے دو، اس کے بدلے میں ہم دس روپے دیں گے۔ اب بچہ خوشی سے دو روپے دے کر دس روپے لے لیتا ہے؛ حالاں کہ وہ دو روپے اور یہ دس روپے دونوں ہی باپ کے ہیں۔

اسی طرح یہ جان بھی اللہ کی اور جنت بھی اللہ کی ہے؛ لیکن اللہ نے جان دے کر کہا کہ تم اپنی سمجھ لو اور مجھے دے دو، میں جنت تمھیں دے دوں گا۔

نفس کو بیچنے کا حاصل

اب یہ سمجھنا ہے کہ اللہ کو نفس بیچنے کا مطلب کیا ہے؟ اللہ کو نفس و جان بیچنے کے متعدد مطالب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ جہاد میں اپنی جان و نفس کی قربانی دی جائے، اور ایک یہ ہے کہ ہمارے تمام کام و اعمال، ہمارے اخلاق، ہماری خواہشات ولذات، یہ ساری چیزیں اللہ کی مرضی کے مطابق ہوتی رہیں، ہماری مرضی کے مطابق نہیں؛ بل کہ غور کریں، تو جہاد بھی اسی لیے قابلِ لحاظ و قابلِ تعریف عمل ہے کہ اس میں اللہ کی مرضی پر اپنی جان دے دی، اگر اللہ کی مرضی پر جان نہ دی جائے؛ بل کہ اس میں اپنے نفس کی کسی خواہش کا دخل ہو، تو وہ جہاد بھی قابلِ تعریف نہیں رہتا اور اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا؛ لہٰذا خلاصہ یہ ہوا کہ اپنی ہر چیز اللہ کی مرضی پر استعمال کی جائے اور اس کی مرضی پر اپنی مرضی کو قربان کر دیا جائے، یہ ہے اللہ کے نام اپنے کو بیچ دینا۔

کیوں کہ قاعدہ ہے کہ جب ایک چیز آپ دوسرے آدمی کو بیچ دیتے ہیں، تو وہ چیز اس کی ہو جاتی ہے، اس کی ہو جانے کے بعد آپ اپنی مرضی اس میں نہیں چلا سکتے۔ اسی طرح جب ہم نے اپنی جان و مال اللہ کو بیچ دیا، اس میں ہم اپنی مرضی نہیں چلا سکتے؛ بل کہ اللہ کی مرضی اس کے اندر چلنی چاہیے۔

ایک گھر آپ نے بنایا، بنانے کے بعد آپ نے (sale) کا آفر (Offer) دیا، لوگ خریدنے کے لیے آئے، آپ نے ایک صاحب کو وہ مکان بیچ دیا اور مکان آپ نے اس کے حوالے کر دیا۔ اب بتائیے کہ اس مکان میں آپ کی مرضی چلے گی یا اُس کی، جس نے اسے خریدا ہے؟ اسی طرح جب ہم نے اپنے نفس کو اللہ کے نام بیچ دیا ہے اور اللہ نے اس کو خرید لیا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ہماری مرضی

نہیں چلے گی؛ بل کہ اللہ کی مرضی کے مطابق اس کو استعمال کرنا ہوگا۔

لہٰذا ہم اپنی مرضی سے آنکھ استعمال نہیں کر سکتے ، اپنی مرضی سے کان استعمال نہیں کر سکتے ، اپنی مرضی سے دل استعمال نہیں کر سکتے ، ہر عضو کے استعمال کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے پوچھنا پڑے گا کہ کیا میں اس جگہ استعمال کر سکتا ہوں؟ اگر اجازت ملے، تو کر سکتے ہیں، ورنہ نہیں؛ کیوں کہ یہ ساری چیزیں اب آپ کی نہیں؛ بل کہ اللہ کی ہیں۔

جدھر میرا مولیٰ اُدھر شاہ دولہ!

ایک بزرگ کی حکایت یاد آئی کہ شاہ دولہ ایک بزرگ تھے، ان کا قصہ ہے کہ شاہ دولہ کے وطن میں ایک مرتبہ طوفان بپا ہوا اور ان کے وطن کے قریب ایک بہت بڑی نہر بہتی تھی، طوفان کی وجہ سے اس نہر کا رُخ شہر کی طرف ہونے لگا، تو سارے لوگ گھبرا گئے اور کہنے لگے کہ اگر ایسا ہوا، تو پھر سارا شہر ڈوب جائے گا؛ اس لیے چلو کسی اللہ والے سے دعا کروالیں، وہاں شاہ دولہ بزرگ موجود تھے، لوگ ان کی خدمت میں آ کر کہنے لگے کہ حضرت! اس وقت نہر کا رخ شہر کی طرف ہے اور خطرے کی یہ صورت ہے، اگر ایسا ہوا، تو پھر سارا شہر ڈوب جائے گا، اللہ تعالیٰ سے آپ دعا کر دیجیے کہ وہ ہم سب کو بچالے۔

تو انھوں نے آنے والوں سے کہا کہ تمھارے پاس پھاوڑے ہیں؟ تو کچھ لوگوں نے کہا کہ ہاں! ہیں، کہا کہ جاؤ پھاوڑے اٹھا لاؤ، لوگ پھاوڑے لے کر وہاں پہنچے اور شاہ صاحب کے ہاتھ میں تھما دیے، شاہ دولہ ان کو لے کر نہر کے اس کنارے پہنچ گئے، جہاں سے پانی آنے کا اندیشہ تھا اور کہنے لگے کہ یہ جو مینڈ لگی ہوئی ہے، اس کو کھود و تا کہ پانی اِدھر کو آجائے۔ لوگ کہنے لگے کہ حضرت! یہ کیا ہو رہا ہے؟

ہم تو یہ کہنے کے لیے آئے تھے کہ اس سے بچیں، یہ تو ہم سے وہ کام کروا رہے ہیں، جس سے کہ شہر ڈوب جائے گا، کہا کہ حضرت یہ کیا؟ اس سے تو شہر ڈوب جائے گا۔

اس پران بزرگ نے ایک جملہ کہا کہ ''جدھر میرا مولیٰ، اُدھر شاہ دولہ'' یعنی جو میرے مالک کی مرضی ہے، وہی شاہ دولہ کی مرضی ہے، میں کوئی کام میرے رب کی مرضی کے خلاف نہیں کروں گا۔

دیکھیے! کس طرح اللہ والے اپنی مرضیات کو اللہ کی مرضی کے تابع کر دیتے ہیں، یہ ہے اپنے نفس کو اللہ کے نام پر بیچ دینا۔

بڑا نفع بخش کاروبار

بھائیو! یہ کاروبار، جو اللہ سے بندہ کرتا ہے، یہ بہت بڑا کاروبار ہے، معمولی کاروبار نہیں ہے؛ اس میں ایک جانب بندہ اپنی جان و مال پیش کرتا ہے اور دوسری جانب، اللہ ایک تو جنت پیش کرتا ہے اور دوسرے جہنم سے نجات کا وعدہ کرتا ہے۔
جنت کا وعدہ تو اوپر کی آیت میں آپ نے سن لیا اور جہنم سے نجات کا وعدہ اس آیت میں ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ (کیا میں تمھیں ایسی تجارت کا پتہ نہ دوں، جو تجارت کہ تمھیں جہنم کے عذاب سے بچانے والی ہے؟) (الصف: ۱۰)

جہنم کے دردناک عذاب سے بچانے والی، یہ ہے وہ تجارت، جس میں آدمی اپنے خواہشات کو اپنے اندر کے جذبات وخیالات کو اپنے تصورات تک کو اللہ کے نام بیچ دیتا ہے، کتنی عظیم تجارت ہے؟

بیعت کی حقیقت

اس کے بعد مجھے اس وقت یہیں سے ایک مضمون سمجھانا ہے، آیت کی تفسیر میں

نہیں؛ لیکن اس کی تفسیر سے نکالا ہوا ایک مضمون۔ وہ یہ کہ جب اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ خود کو اللہ کے نام بیچنے کی تعلیم فرمائی گئی ہے، تو صوفیہ اور بزرگوں کے یہاں جو ایک سلسلہ چل رہا ہے، جس کا نام ہے ''بیعت''، اس سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے؛ وہ کس طرح؟ میں اس وقت اسی کو سمجھانا چاہتا ہوں۔

پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ بیعت کا معنیٰ کیا ہے؟ یہ لفظِ ''بیعت'' ''بَاعَ ، یَبِیْعُ'' کا مأخذ ہے، جس کے معنے ہیں ''بیچنا'' جو معنیٰ ''شریٰ یشري'' کے ہیں، وہی اس کے بھی ہیں، لفظ کا فرق ہے؛ لیکن معنیٰ وہی ہے، تو بیعت کے معنے ہیں بیچنا۔

جب آدمی کسی شیخ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شیخ کو واسطہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے خرید و فروخت کا ایک معاملہ کرتا ہے؛ یعنی اپنے نفس کو اللہ کے ہاتھ بیچتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو جنت عطا کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ یہ ہے ''بیعت''، جو مشائخ کے یہاں جاری و ساری ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بیعت میں اصل اللہ سے معاملہ ہوتا ہے اور شیخ صرف درمیان میں واسطہ ہوتا ہے؛ لہٰذا بیعت بھی دراصل اللہ کے نام اپنی جان و نفس کو بیچنا ہی ہے اور اس کا حکم اور اس کی ترغیب پہلے معلوم ہو چکی؛ لہٰذا بیعت بھی اسی سے ثابت ہو گئی؛ کیوں کہ اس حکم ہی کی ایک صورت و شکل یہ بھی ہے۔

شیخ کی حیثیت

اب رہا یہ سوال کہ پھر شیخ کی کیا ضرورت ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اصل تو اللہ ہی سے یہ معاملہ ہے، مگر جیسے دنیوی کاروبار میں بھی ماہر لوگ ''کاروباری ایجنٹ'' ہوتے ہیں، جو آپسی معاملہ طے کراتے اور اس کی باریکیاں سمجھاتے ہیں اور اس میں رہبری و رہنمائی کرتے ہیں، اسی طرح بیعت یہ ہے کہ جو معاملہ بندہ اور اللہ کے

مابین ''بیعت''، یعنی نفس کو بیچنے وخریدنے کا ہورہا ہے، اس میں شیخ ایک واسطہ ہوتا ہے، بندے اور اللہ کے درمیان ہونے والی عظیم تجارت کا۔ یوں سمجھیے کہ شیخ گویا ایجنٹ (Ajent) ہوتا ہے؛ اس لیے کہ شیخ کو اس میں مہارت ہوتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی مرضیات ونامرضیات سے بخوبی واقف ہوتا ہے، اس راہ کی باریکیوں سے واقف ہوتا ہے۔

اب اس تجارت کے درمیان جو کچھ معاملے ہوتے ہیں، شیخ کو اس کی اطلاع دیتے رہنا ہے کہ جناب میں نے بیچ تو دیا ہے؛ لیکن اب جی نہیں چاہ رہا ہے، وہ کہے گا: بے وقوف! بیچ تو دیا، اب جی نہیں چاہ رہا ہے، یہ معاملہ فسخ نہیں ہوگا، اس کو ٹھیک کر کے چلاؤ۔ تم نے بیچ تو دیا پیسے تو لے لیے یعنی ''جنت'' اس لیے کسی طرح نبھاؤ۔ اب وہ سکھاتا رہے گا، بتاتا رہے گا، وقت وقت پر مشورے دیتا رہے گا تاکہ معاملہ ٹھیک چلتا رہے۔

میں نے جو کہا کہ شیخ صرف واسطہ ہے اور اصل معاملہ تو اللہ سے ہے اس کی دلیل بھی سن لیجیے، اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بیعت کا ذکر کیا ہے اور اس میں اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم جو لوگوں کو بیعت لیا کرتے تھے، اس کا ذکر کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا ہے کہ جو لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں، وہ دراصل اللہ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ﴾ (اے محمد! جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں، یہ حقیقت میں اللہ سے بیعت کرتے ہیں، اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے) (الفتح: ۱۰)

عربی پڑھنے والے جانتے ہیں کہ ''إِنَّمَا'' حصر کا مفہوم دیتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اے نبی! جو لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں، وہ صرف اور صرف اللہ

کے ہاتھ پر بیعت کررہے ہیں کسی اور سے نہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے بیعت کو اپنی جانب منسوب کیا ہے؛ حالاں کہ ظاہراً وہ نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ہاتھ پر ہورہی تھی۔اسی طرح اس سلسلے میں جو لوگ شیخ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں،تو سمجھنا چاہیے کہ وہ اللہ سے بیعت ہورہے ہیں،معاملہ اللہ سے ہورہا ہے۔گویا بندہ کہہ رہا ہے کہ اے اللہ! میں بیچتا ہوں، تو خریدتا ہے اے اللہ! اب یہ جان میری نہیں،مال میرا نہیں؛اس لیے اے اللہ!اس میں اب میری نہیں،آپ کی مرضی چلے گی، میں اپنی آنکھ کو تیری مرضی کے خلاف نہیں استعمال کروں گا،نہ ہاتھ پیر کو،نہ میرے کسی عضو کو، تیری مرضی کے خلاف کوئی عمل نہیں کروں گا۔یہ ہے حقیقت بیعت کی۔

شیخ کی ضرورت

اس سے شیخ کی ضرورت بھی سمجھ میں آگئی کہ شیخ اس راہ کا ماہر ہونے کی وجہ سے ہماری رہبری کرتا ہے۔ورنہ بہت سے لوگ اللہ سے معاملے کو توڑ دیتے اور اس کے تقاضوں کے خلاف چل کر اس کو فاسد کرلیتے ہیں؛ نیز شیخ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ ہمیں ہمارے ان اعضا کو کس طرح اللہ کی مرضی کے مطابق استعمال کرنا چاہیے،جنھیں ہم نے اللہ کے نام پر بیچ دیا ہے اور چوں کہ شیطان ہمارے پیچھے لگا ہوا ہے اور وہ ہمیں غلط مشورے دیتا ہے اور ہماری بیعت و معاملے کو توڑنے کی کوشش کرتا رہتا ہے؛ اس لیے بھی شیخ کی ضرورت پڑتی ہے کہ وہ ہمیں وقتاً فوقتاً رہبری کرتا رہے۔

بیعت کی برکت اور حضرت گنگوہی رَحِمَہُ اللّٰہُ کا واقعہ

اور دوسری بات یہ ہے کہ بیعت ہونے سے بزرگوں کے سلسلے کی برکات بھی نصیب ہوتی ہیں اور انسان کے لیے مجاہدہ و عمل آسان ہو جاتا ہے۔’’حضرت

مولانا رشید احمد گنگوہی رَحِمَہُ اللّٰہُ ''، ''حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی رَحِمَہُ اللّٰہُ ''
کے خلیفہ تھے اور ان کو خلافت صرف چالیس دن میں ملی، صرف چالیس دن میں وہ
منزلیں طے کرتے کرتے نسبت مع اللہ کی دولت سے مشرف ہو گئے تھے۔ ان
کا قصہ عجیب ہے؛ حضرت حاجی صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ تھانہ بھون کی خانقاہ میں رہتے
تھے، رشید احمد گنگوہی رَحِمَہُ اللّٰہُ جوان آدمی تھے، جوانی کا بڑا جوش وجذبہ تھا، تھانہ
بھون میں ایک بہت بڑے عالم شیخ محمد تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ رہتے تھے، کسی مسئلے میں
ان بزرگ سے مولانا کو اختلاف تھا، تو ان سے مناظرہ کرنے کی نیت سے وہ تھانہ
بھون گئے، راستے میں حضرت حاجی امداداللہ صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ کی خانقاہ نظر آئی،
تو سوچنے لگے کہ حاجی صاحب یہاں رہتے ہیں، بزرگ آدمی ہیں، ملاقات کر لینا
چاہیے، تو ملاقات کرنے چلے گئے، حاجی صاحب نے پوچھا کہ کہاں سے آئے ہو؟
کہا کہ گنگوہ سے آیا ہوں، پوچھا کیوں آئے ؟ کہا کہ حضرت مولانا شیخ محمد صاحب
سے فلاں مسئلے میں مناظرہ ومباحثہ کرنے کے لیے آیا ہوں۔

حاجی صاحب نے کہا کہ بھائی! وہ تو تمھارے سے بڑے عالم ہیں، مناسب
نہیں معلوم ہوتا کہ تم ان سے مناظرہ کرو؛ لہٰذا یہ خیال ترک کر دو۔ حضرت حاجی
صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ کی بات ان کے دل میں آ گئی، تو کہا کہ ٹھیک ہے، جب ایک
بزرگ کہہ رہے ہیں، تو مان لیتا ہوں کہ ان سے مناظرہ نہیں کروں گا۔ پھر وہیں
خانقاہ میں رات میں ٹھہر گئے۔ جب صبح سحری کا وقت ہوا تو دیکھا کہ حاجی صاحب
کے مریدین اور بہت سارے ذاکرین، شاغلین، طالبین موجود ہیں اور ذکر ودعا،
نماز وتلاوت وغیرہ عبادات میں مشغول ہیں اور ایک عجیب کیفیت وسماں نظر آنے
لگا، جب یہ دیکھا، تو دل میں یہ خیال آیا کہ مجھے بھی بیعت ہو جانا چاہیے؛ پھر حاجی

صاحب سے بیعت کی درخواست کی کہ حضرت مجھے بیعت کر لیجیے۔ حضرت نے کہا کہ بہت اچھا اور بیعت کرانے تیار ہو گئے؛ اس لیے کہ حاجی صاحب سے جو بھی بیعت کی درخواست کرتا، تو اسے فوراً قبول کر لیتے تھے۔

پھرنے اور پھر جانے والے نہیں چاہئیں

بزرگوں کے الگ الگ معاملات و اصول ہیں، بعض ایسے ہیں، جو بہت پھراتے ہیں، پھراتے کیوں ہیں؟ اس لیے کہ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ پھرنے والا یا پھر جانے والا تو نہیں؟ پھرنے والا وہ ہے، جو ایک جگہ اطمینان سے یکسوئی سے نہیں رہتا؛ بل کہ شیخ بدلتا رہتا ہے، آج یہاں اور کل وہاں اور پھر جانے والا وہ ہے، جو پھر آتا ہی نہیں، بس ذرا سا جذبہ اُبھرتا ہے اور پھر ختم ہو جاتا ہے؛ لہٰذا مشائخ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ پھرنے یا پھر جانے والا تو نہیں؛ بل کہ یہاں تو پھر آنے والا ہونا چاہیے، پھر جانے والا نہیں؛ اس لیے اسے پھراتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ بیعت کی درخواست کی، تو فوراً قبول کر لیا، حاجی صاحب کا بھی یہی معاملہ تھا۔ کسی کے پوچھنے پر کہ حضرت! آپ ہر ایک کو فوراً کیوں بیعت کر لیتے ہیں؟ فرمایا کہ ہاں! اس لیے کر لیتا ہوں کہ معلوم نہیں کونسا اللہ کا بندہ نیک اور مقبول ہوگا، اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دے گا، تو میری مغفرت ہو جائے گی۔ اللہ اکبر! کیا عاجزی، کیا سادگی ہے!!!

الغرض! حاجی صاحب رحمہ اللہ نے بیعت کی، اب بیعت کے وقت بزرگوں کا معمول ہے کہ وہ کچھ معمولات بتاتے ہیں، حاجی صاحب بتانے جا رہے تھے کہ مولانا رشید احمد صاحب رحمہ اللہ نے عرض کیا کہ حضرت! میری ایک درخواست ہے، وہ یہ کہ مجھے صبح تہجد کے لیے اٹھا نہیں جاتا؛ اس لیے وہ ایک کام چھوڑ کر دوسرا جو چاہے حکم کیجیے۔ حضرت نے کہا ٹھیک ہے، جو تم کر سکتے ہو کر لینا؛

لیکن میں نے تمھاری ایک شرط مان لی، تم بھی میری ایک شرط مان لو، وہ یہ کہ میرے پاس چالیس دن قیام کرو۔ مولانا رشید احمد صاحب نے کہا کہ ٹھیک ہے۔اب چالیس دن کی نیت کر کے خانقاہ میں رہ گئے، جب دوسرے دن صبح ہوئی، تو سالکین ذکر وفکر میں اور رونے دھونے میں مشغول ہیں، کوئی نماز پڑھ رہا ہے، کوئی ذکر کر رہا ہے، کوئی دعا میں ہے کوئی تلاوت کر رہا ہے۔اب ان کو نیند کہاں آئے گی؟ دو چار منٹ بستر پر پڑے کروٹیں بدلتے رہے، پھر ان کو بھی شرم آنے لگی کہ سب تو ذکر و عبادت میں ہوں اور تو پڑا رہے! تو خود ہی اٹھ کر تہجد پڑھنے لگے اور ذکر میں مشغول ہو گئے، اب روز ایسا ہی ہونے لگا اور دو چار دن بعد خود ہی طبیعت کے اندر داعیہ پیدا ہونے لگا کہ صبح اٹھو اور عبادت کا چسکہ پاؤ؛ لہٰذا سب سے پہلے اٹھنا شروع کر دیا؛ حالاں کہ بیعت کے وقت تو یہ شرط لگائی تھی کہ صبح کو نہیں اٹھوں گا؛ لیکن صحبتِ اولیاء کی برکت سے سب سے پہلے اٹھنا شروع کر دیا، پہلے تو جبراً اٹھتے تھے؛ لیکن پھر قصداً اٹھنا شروع کر دیا، جب اسی طرح چالیس دن گزر گئے، تو حاجی صاحب نے خلافت عطا کر دی۔

جب تھانہ بھون سے رخصت ہوئے اور اپنے وطن گنگوہ پہنچ گئے، تو کئی مہینے ہو گئے اور حاجی صاحب کو ان کے حالات کا کچھ پتہ ہی نہ چلا، نہ خیر، نہ خیریت، نہ حال و احوال، تو حاجی صاحب نے مولانا کے نام ایک خط بھیجا، اس میں لکھا کہ تمھاری کوئی خبر نہیں معلوم ہوئی، بندے کو تشویش ہوئی؛ اس لیے اپنے حالات سے مُطّلع کیجیے، یہ خط پہنچا، تو اس کو پڑھا اور جواب لکھا کہ حضرت! میں نے اپنے حالات اس لیے نہیں لکھے کہ بندے کا کوئی حال ہے ہی نہیں تو کیا لکھوں؟ اس کے بعد لکھا کہ بس اتنا میں اپنے اندر محسوس کرتا ہوں کہ کسی کی کوئی مدح وذم کا کوئی اثر بندے پر نہیں ہوتا، دوسری بات یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں آئی ہوئی تعلیمات

میں کسی جگہ کسی قسم کا شک نہیں ہوتا۔

بھائیو! بیعت کی برکت اور اہمیت وضرورت کا اندازہ کرو کہ بزرگوں کی نظر انسان کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔

مرید کی تعریف-حضرت گنگوہی رَحِمَہُ اللّٰہُ کا قصہ

مگر ایک بات یاد رکھیے کہ شیخ کی باتوں کو بغیر چوں وچرا مان کر چلیں گے، تو فائدہ ہوگا اور اگر شیخ کی چلانے کے بہ جائے، خود اپنی چلانے لگے اور شیخ کے مشوروں کو عمل میں نہ لائے، تو اس کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

اسی لیے مرید کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ اپنی رائے نہ چلائے۔ اس پر ایک واقعہ یاد آ گیا کہ ایک طالبِ علم ''سید الطائفہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رَحِمَہُ اللّٰہُ '' کی خدمت میں آ کر کہنے لگا کہ حضرت! میں آپ سے مرید ہونا چاہتا ہوں۔ حضرت نے فرمایا کہ مرید ہونے آئے ہو؟ اچھا یہ بتاؤ کہ مرید کے معنیٰ کیا ہے؟ طالبِ علم تھا، عربی صرف پڑھا ہوا تھا، اس نے گردان شروع کر دی، ''أَرَادَ ، يُرِيْدُ ، إِرَادَةً فهو مُرِيْدٌ'' اس نے کہا کہ حضرت! کسی کام کے ارداہ کرنے والے کو مرید کہتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ غلط ہے، صحیح نہیں، اب بے چارہ سوچنے لگا کہ اس میں کیا غلط ہے؟ ہمارے اساتذہ نے یہی پڑھایا ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ '' فصولِ اکبریٰ'' بھی پڑھی ہے؟ فصولِ اکبری عربی صرف کی ایک کتاب ہے، اس کے اندر بہت سے مضامین کے ساتھ خاصیاتِ ابواب کا بیان بہت تفصیل کے ساتھ آیا ہے، تو اس طالبِ علم نے جواب دیا، جی ہاں پڑھی ہے، فرمایا کہ ''بابِ افعال'' کی خصوصیات کیا ہیں؟ اب اس نے گنانا شروع کیا، اس میں ایک خصوصیت یہ گنائی کہ ''سلبِ ماخذ''۔ حضرت نے کہا کہ کیا

مطلب ہے؟ کہا کہ ماخذ کو سلب کر لینا اور ماخذ کی نفی کر دینا، کہا کہ ٹھیک ہے، اب اس خصوصیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مرید کا معنیٰ یہ ہوتا ہے: ”ارادے کو سلب کر لینا“، یعنی ارادہ نہیں کرنا۔ تو مرید کے معنے ہوئے ارادہ نہیں کرنے والا۔ حضرت نے کہا کہ مرید کون ہوتا ہے؟ جو ارادہ نہیں کرتا یعنی اپنی مرضی و ارادے سے کوئی کام نہیں کرتا؛ اس لیے کہ اس نے اللہ کی مرضی پر سب کچھ چھوڑ دیا ہے، جس نے بیعت کرتے ہوئے سب کچھ اللہ کی مرضی پر چھوڑ دیا، اس نے گویا یہ کہہ دیا کہ اے میرے مالک وخالق! میں نے اپنی جان ومال کو تیرے حوالے کر دیا اور تجھے بیچ دیا، اب اس میں میری مرضی نہیں چلے گی، جو چلے گا، وہ تیرا ارادہ اور تیری مَشِیَّت چلے گی۔

فرمایا کہ یہ معنیٰ سمجھ کر جو بیعت کرتا ہے کہ مجھے کسی کام کا ارادہ نہیں کرنا ہے؛ بل کہ شیخ کی جانب سے اس راہ کے بارے میں جو کہا جائے، اس پر عمل کرتے رہنا ہے، وہ ہوتا ہے حقیقی مرید اور جو ارادے پر ارادے کرتا ہے، شیخ ایک کہتا ہے اور اس کا ارادہ الگ ہوتا ہے، قرآن وحدیث ایک کہتی ہے، اس کا ارادہ الگ۔ تو بھائی یہ مرید نہیں ہے، یہ تو مراد ہو گیا۔

الغرض! جو شخص کسی سے بیعت ہو کر اپنی اصلاح کرانا چاہتا ہے، اس کو چاہیے کہ وہ اپنے شیخ کی اتباع کرے اور اس کے مشورے پر قائم رہے۔

نفس کو بیچ دینے کے بعد تین باتیں ضروری ہیں

اب آخر میں ایک بات اور سن لیں کہ جب اللہ کے نام ہم اپنے آپ کو بیچ دیں، تو اس میں تین باتیں ضروری ہوتی ہیں۔ پہلی بات: یہ کہ جب ہم نے نفس کو اللہ کے ہاتھ بیچ دیا ہے، تو اب اگر اللہ حکم دے کہ نماز پڑھو، تو پڑھنا پڑے گا؛ اگر ہم نے ایسا نہیں کیا، تو پھر اللہ تعالیٰ ہم سے پوچھے گا کہ تمھاری مرضی تم نے کیوں چلائی؟

ہماری مرضی کیوں نہ چلائی؟ اگر اللہ روزہ رکھنے کا حکم دے، تو اسے ماننا ضروری ہوگا۔اسی طرح جتنے احکامات ہیں سب کے بارے میں یہی حکم ہے، زکوٰۃ ہے، حج ہے، ذکر وتلاوت ہے وغیرہ۔اللہ تعالیٰ کہے گا کہ یہ میری مشین ہے، جسے تم نے بیچ دیا ہے،اب اس میں میرا تصرف چلے گا تمھارا نہیں۔

دوسری بات: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن جن باتوں سے دور رہنے اور پرہیز کرنے کو کہہ دیا ہے ان سے پرہیز کرنا بھی ضروری ہے،اس نے کہہ دیا کہ شراب نہیں پینا، زنا نہیں کرنا، جھوٹ نہیں بولنا، دھوکہ نہیں دینا، جھوٹ وغیبت میں یہ زبان جس کا میں مالک ہوں،اس میں اس کو استعمال نہیں کرنا، ہاتھ کو چوری کے لیے اور پیروں کو غلط جگہ جانے کے لیے استعمال نہیں کرنا، یہ اللہ نے قانون بنا کر ہم کو بتا دیا کہ یہ ہے قانون؛ اگر قانون کی خلاف ورزی ہوئی، تو بیع کے وعدے کے خلاف عمل ہونے کی وجہ سے بیع ٹوٹ جائے گی، فسخ ہو جائے گی، اب بغیر سزا کے جنت کیسے ملے گی؟ جنت کا تو مَدار اسی پر تھا کہ جو تم نے دے دیا ہے، وہ دے دو، اس میں اپنا کچھ تصرف نہ کرو، اگر تم نے تصرف کر دیا، تو پھر جنت کا کیا سوال؟ لہٰذا ممنوعات سے اجتناب ضروری ہے۔

تیسری بات: بڑی اہم ہے، وہ یہ کہ یہ نفس ہم نے بیچ دیا، مالک اللہ ہے، وہ اگر اس میں کچھ تصرف کرنے لگے۔ مثلاً بخار داخل کر دی، پیٹ وسر میں درد ہونے لگا یا اور کوئی بات پیش آ گئی، جس کو حوادث وپریشانیاں آفتیں ومصائب کہتے ہیں، یہ سب کا سب وہیں اوپر سے ہوتا ہے۔اور ہم کہنے لگیں کہ اللہ نے مجھے کیوں بخار دے دی؟ یا اللہ نے ہمارے کسی رشتہ دار کو موت دے دی، انتقال ہو گیا، تو اس میں ہمیں کوئی حق نہیں کہ کچھ بولیں؛ بل کہ سب کچھ اس کا ہے اور اسی کا چلتا ہے۔

یہ تین چیزیں "یشری نفسهٔ" میں داخل ہیں، جب بندہ یہ تینوں کام کرے گا، تو سمجھو کہ اس نے اپنے نفس کو بیچ دیا، جب بیچا، تو عوض میں اللہ اسے جنت دے گا۔
اللہ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان مقربین میں شامل کر لے، جنھوں نے اللہ کے لیے اپنے نفسوں کو بیچ کر اس کے عوض جنت خرید لی۔

آمین یا رب العالمین۔

اطاعت
مومن کی حیات
ہے
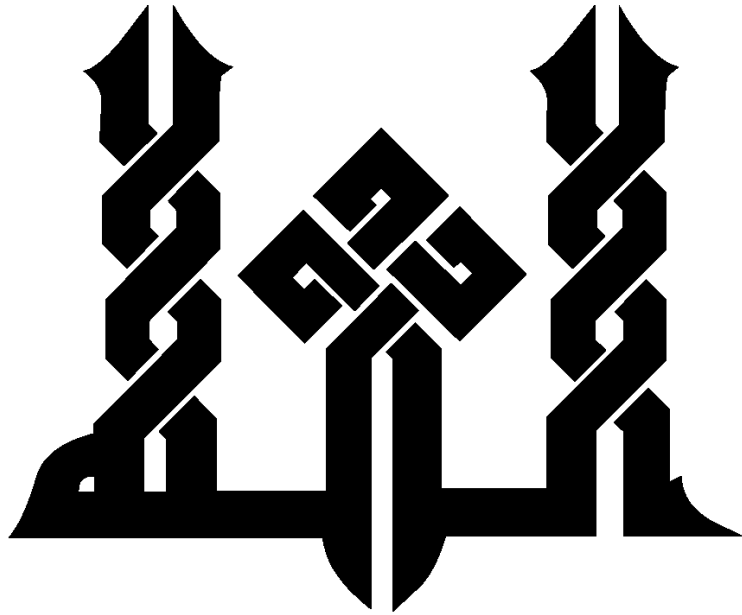
بسم اللہ الرحمن الرحیم

"اطاعت" مومن کی حیات ہے

الحمدللّٰہ و کفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ . أمابعد

فقد قال اللّٰہ تعالیٰ في القرآن الکریم

أعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم ، بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ ﴾ (الأنفال:۲۴)

دینی بھائیو!

یہ سورۂ انفال کی ایک آیت ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ "اے ایمان والو! جب اللہ اوراس کا رسول تمھیں دعوت دے اور بلائے اس چیز کی طرف، جو تمھیں زندگی بخشنے والی ہے، تو تم اللہ اور اللہ کے رسول کی دعوت پر لبیک کہو" اور آج کل چوں کہ انگریزی زبان رائج ہے، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا (Reply) دو اور (Response)

مذکورہ آیت میں ایک خاص قسم کا مضمون ہے، سب سے پہلی بات جو یہاں قابلِ غور ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "جب اللہ اور اللہ کا رسول دعوت دے، تو تم اس کی دعوت کو قبول کرو"، ظاہر بات ہے کہ جب کوئی دوسرا آدمی ہم کو دعوت دے، تو حکم ہے کہ ہم اس کی دعوت کو قبول کریں۔

حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ ایک مومن

کے دوسرے مومن پر پانچ حق ہیں، ان میں سے ایک حق یہ ہے کہ وہ دعوت دے، تو اس کی دعوت کو قبول کرے۔ (المسلم: ۳۷۶۴)

جب ایک عام مومن کی دعوت قبول کرنے کا حکم ہے، تو کیا خیال ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ہم کو دعوت دے اور ہم اس کو ٹھکرا دیں، کیسے ہو سکتا ہے؟ دوسری بات یہ قابلِ غور ہے کہ دعوت کئی قسم کی ہوتی ہے، کوئی کھانے کی دعوت پر بُلاتا ہے، کوئی چائے کی دعوت دیتا ہے اور کوئی جلسے کی دعوت دیتا ہے، اس طرح لوگ دنیا میں مختلف قسم کی دعوتیں دیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کس بات کی دعوت دیتے ہیں؟ اس آیت میں اس کا جواب دیا گیا، فرمایا کہ ”لِمَا يُحْيِيكُمْ“ کہ اللہ اور اس کا رسول تمھیں اس چیز کی دعوت دیتے ہیں، جو تمھیں زندگی بخشنے والی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دین دراصل مومن کی حیات و زندگی کا سامان ہے؛ لہٰذا دعوتِ دین کو اور پیغامِ الٰہی و پیغامِ نبوی کو قبول کرنے ہی میں ہماری زندگی ہے اور اگر اس دعوتِ دین و پیغامِ الٰہی کو قبول نہیں کریں گے، تو زندگی نہیں ملے گی۔

دین ہے، تو انسان زندہ ہے

اسی وجہ سے قرآن کریم نے کافر کو مُردہ کہا ہے؛ چناں چہ ایک جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ﴾ (کیا وہ جو مردہ تھا، پھر ہم نے اس کو زندہ کیا) (الأنعام: ۱۲۲)

علما لکھتے ہیں کہ اس آیت میں مُردے سے مراد کافر ہے اور زندہ کرنے سے مراد ایمان عطا کرنا ہے۔ معلوم ہوا کہ ”ایمان“ دراصل زندگی ہے اور ”کفر“ دراصل موت ہے، اسی بات کو پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے دوسرے الفاظ میں کہا کہ جو چیز کہ

تم کو زندگی دینے والی ہے، اس چیز کو تم قبول کرلو، اگر تم اس کو قبول نہیں کروگے، تو مردہ رہوگے، زندہ نہیں رہوگے۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو اور اپنے احکامات کو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو" لِمَا يُحْيِيكُمْ" سے تعبیر کیا۔

اس سے معلوم ہوگیا کہ زندگی دراصل دین کے اندر ہے، اگر دین ہے، تو انسان زندہ ہے اگر دین نہیں ہے، تو انسان مُردہ ہے۔اس لیے ہم یوں کہہ سکتے ہیں" اَلدِّيْنُ هُوَالْحَيَاةُ "(دین تو حیات کا نام ہے) یا یوں کہہ سکتے ہیں" اَلدِّيْنُ هُوَ رُوْحُ الْإِنْسَانِ"(دین انسان کی روح ہے) جب انسان کے اندر وہ روح یعنی دین آئے گا، تب ہی وہ زندہ رہے گا اور اگر وہ روح نکل گئی، تو سمجھو کہ وہ مُردہ ہوگیا۔

مُردے کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی

بھائیو! آج ہم لوگ بہت ساری شکایتوں کی باتیں کرتے رہتے ہیں کہ دنیا میں ہماری کوئی بات نہیں چلتی اور لوگوں کی نگاہوں میں ہمارا کوئی مقام نہیں، ہماری کوئی شان وشوکت نہیں؛ لیکن کبھی اس پر بھی غور کیا کہ مُردے کی کیا حیثیت ہوتی ہے؟ کیا مردے کو اسٹیج پر لاکر بٹھایا جاتا ہے یا قبر میں دفن کیا جاتا ہے؟ انسان کی حیثیت اُسی وقت تک ہے، جب تک کہ وہ زندہ ہے، ظاہری زندگی میں بھی یہی ہے کہ جب تک ظاہر میں زندہ ہے، لوگ اس کی حیثیت کو مانتے ہیں، اگر اس کے اندر سے روح نکل جائے، تو وہ اینٹ، پتھر اور مٹی کی طرح بے حیثیت ہو جاتا ہے؛ لیکن جب تک اس کے اندر روح ہوتی ہے اور وہ کام کرتا ہے، دیکھتا ہے، بولتا ہے اور سنتا ہے اور دیگر کام انجام دیتا ہے، تو اس کی ایک پوزیشن (position) ہوتی ہے، اس کی ایک حیثیت ہوتی ہے، اس کی بات مانی جاتی ہے، اس کو اسٹیجوں پر بٹھایا جاتا ہے، اس کی خدمت کی جاتی ہے؛ لیکن جب انسان مر جاتا ہے اور مردوں میں شامل ہو جاتا ہے، تو وہ

بڑے سے بڑا بادشاہ ہی کیوں نہ ہو، اس کے مرنے کے بعد کوئی اسے بادشاہ نہیں کہے گا اور اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی، اس کا حکم نہیں چلے گا، اس کی بات مانی نہیں جائے گی اور مرنے کے بعد، جو حیثیت اس کی سمجھی جاتی ہے، وہ بھی دراصل دنیا کی زندگی کی وجہ سے ہے، جیسے کوئی بڑا آدمی مرجاتا ہے، تو تین دن رکھ کر شو بازی کی جاتی ہے، بینڈ (band) بجارہے ہیں، ناچ رہے ہیں اور اسے سَلا میاں دی جارہی ہیں؛ جیسے کسی وزیرِ اعظم کا انتقال ہو جائے، یا کوئی چیف منسٹر چل بسے، تو یہ سب کچھ ہوتا ہے؛ لیکن اس لیے نہیں ہوتا کہ وہ مرگیا ہے؛ بل کہ اس لیے ہوتا ہے کہ وہ اس سے پہلے زندہ تھا، تو اس کی زندگی کی حیثیت اور نسبت کی وجہ سے یہ سب کیا جاتا ہے، اب جب مرگیا ہے، تو وہی سلوک اس کے ساتھ بھی کیا جاتا ہے، جو دوسروں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

باطنی زندگی اور باطنی موت

یاد رکھیں کہ جیسے ایک انسان کی ظاہری زندگی اور موت ہوتی ہے، اسی طریقے پر اسلامی نقطۂ نظر سے انسان کی ایک باطنی زندگی اور باطنی موت بھی ہوتی ہے اور یہ ایک اتنا بُنیادی و اساسی مسئلہ ہے کہ جگہ جگہ قرآن کریم میں اور محمد رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی احادیث میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی آپ کو قرآن کے حوالے سے بتایا کہ قرآن میں کافر کو مردہ کہا ہے۔

پھر جیسے ظاہری زندگی بعض وجوہات کے سبب ہوتی ہے کہ کھانا، پینا، وغیرہ کہ کھانے، پینے سے یہ ظاہری حیات وابستہ ہے، اسی طرح کی اور کئی قسم کی چیزوں سے استفادہ کرتا ہوا انسان زندہ رہتا ہے اور جب موت کا وقت آتا ہے، تو انسان ختم کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح باطنی موت وحیات کا تعلق بھی کچھ باطنی چیزوں پر ہے،

وہ کیا چیزیں ہیں؟ وہ دین و دینی امور ہیں کہ جب انسان دین قبول کرے گا اور اس کے مطابق اپنی زندگی میں چلے گا، تو انسان کو باطنی زندگی ملے گی اور اگر دین کو قبول نہیں کرے گا یا اس کے مطابق اپنی زندگی میں نہیں رہے گا، تو انسان ظاہری اعتبار سے زندہ رہنے کے باوجود بھی مردوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہی ہے وہ حقیقت جسے قرآن کریم نے " لِمَا يُحْيِيكُمْ" میں بتایا ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم زندہ تھے اور آج ہم مردہ ہیں!

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم میں اور آج کے دور کے مسلمانوں میں یہی فرق ہے کہ حضرات صحابۂ کرام، اللہ اور رسول کی دعوت کو قبول کرنے کی وجہ سے ظاہراً و باطناً زندہ تھے اور ہم لوگ، اللہ اور اس کے رسول کی دعوت کو قبول نہ کرنے یا قبول کرنے کے بعد اس کے مطابق نہ چلنے کی وجہ سے ظاہراً زندہ ہونے کے باوجود، باطنی طور پر مردہ ہیں۔

جس کی وجہ سے آج ہماری کوئی حیثیت نہیں ہے، کوئی مقام نہیں ہے، کوئی پوزیشن (position) نہیں ہے؛ اس لیے کہ مردے کا کوئی مقام نہیں ہوتا، آج ہمارا حال اتنا بُرا ہو گیا ہے کہ ہرا اَیرا، غَیرا، گھٹیا کمزور اور ضعیف تر انسان بھی مسلمانوں کے خلاف زبان چلاتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتا ہے، قرآن کے خلاف لب کُشائی کرتا ہے، اسلامی قوانین میں دخل اندازی کرتا ہے؛ لیکن مسلمان آج کروڑوں کی تعداد میں ہونے کے باوجود، ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے؛ کیوں؟ اس لیے کہ ہماری باطنی روح یعنی حبِ الٰہی، اطاعتِ رسول، سنتوں سے محبت نکل چکی ہے اور ہمارا باطن مر چکا ہے۔ یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ مردے لاکھوں ہوں یا کروڑوں ہوں، وہ نہ ہونے کے برابر ہیں، کیا ایک لاکھ مردے کوئی معمولی سا کام بھی کر سکتے ہیں؟ کیا ان سب کو ملا کر کھڑا کر دینے سے کوئی مضبوط

طاقت وجود میں آسکتی ہے؟ ہم کو معلوم ہے کہ لاکھوں مردے مل کر ایک مکھی کو بھی نہیں مار سکتے؛ اس لیے اگر ہماری بات میں کوئی اثر نہیں اور ہماری جمعیّت میں کوئی طاقت نہیں، تو کوئی تعجب نہ ہونا چاہیے کہ یہ عین سنتِ الٰہی کے مطابق ہے کہ مردے میں کوئی طاقت نہیں ہوتی؛ لہٰذا ہم میں بھی روحانی اعتبار سے کوئی طاقت نہیں ہے۔

اس کے بر خلاف صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں کا مطالعہ کیجیے، معلوم ہوگا کہ روحانی زندہ انسان کیسا طاقتور ہوتا ہے، اس کی کیا پوزیشن ہوتی ہے، اس کا کیا مقام ہوتا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے نعروں میں وہ طاقت تھی کہ شاہی محلات میں زلزلہ بپا ہوجاتا تھا اور ساٹھ صحابہ ساٹھ ہزار کو شکستِ فاش دینے میں کام یاب ہوجاتے تھے۔

بدر کے معرکے میں تین سو تیرہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے، جن کے پاس اسلحہ تک موجود نہ تھا، کافر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگئے اور میدانِ جنگ سے ناکام و نامراد، راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوئے، یہ صحابہ وہ تھے کہ دریا میں بے خوف وخطر گھوڑے ڈال دیتے تھے اور سمندر پار کر جاتے تھے، جنگل میں جا کر اعلان کرتے، تو سارے جانور جنگل خالی کردیتے تھے۔ (دیکھو: حضرت جی حضرت مولانا یوسف صاحب کاندھلوی کی عجیب وعظیم کتاب "حیاۃ الصحابہ")

صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہ مقام اور پوزیشن، رُعب ودبدبہ صرف اور صرف اطاعتِ رسول کی وجہ سے تھا، اگر وہ حیثیت وپوزیشن اپنے اندر لانا ہے، تو پھر ضروری ہے کہ اللہ کے دین کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، اللہ سے تعلق قائم کیا جائے، سنتوں کو گلے سے لگایا جائے۔

کیا ہم مسلمان نہیں؟ - ایک سوال کا جواب

یہاں پر ہوسکتا ہے کوئی سوال کرنے لگے کہ ہم سب تو ماشاء اللہ مسلمان

ہیں، دین کو مانتے ہیں، اللہ کو مانتے ہیں، رسول اللہ کو مانتے ہیں، ہمارا قرآن پر ایمان ہے، اس سے زیادہ ہم کیا کریں؟ اور پھر بھی آپ ہم کو مردہ کیوں کہہ رہے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جی ہاں! ہم الحمدللہ مسلمان ہیں، ہمارا ماشاء اللہ قرآن پر ایمان ہے، ہم دین کو مانتے ہیں، اللہ کو مانتے ہیں، رسول اللہ کو مانتے ہیں؛ لیکن جیسا کہ میں نے اشارہ کیا کہ شریعت کے بہت سے اجزا ہیں، ہم نے کچھ اجزا کو مانا اور کچھ کو چھوڑ دیا ہے، ہر آدمی اپنے اعتبار سے غور کرے کہ وہ شریعت کی کتنی چیزوں کی اتباع کرتا ہے اور کتنی چیزوں کو چھوڑ دیتا ہے۔ کچھ لوگوں کو کچھ چیزیں شریعت کی پسند آتی ہیں، تو وہ ان کو لے لیتے ہیں اور کچھ چیزیں پسند نہیں آتیں، تو ان کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔

یہ ہے وہ صورت، جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہودیوں کی صفت میں بیان فرمایا ہے: ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ﴾
(کیا تم اللہ کی کتاب کے بعض حصے کو مانتے ہو اور بعض کا انکار کر دیتے ہو)

(البقرۃ: ۵۸)

اسی آیت کے آگے ایک اور جگہ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ ﴿اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ﴾ (کیا جب کبھی تمہارے پاس کوئی پیغمبر وہ چیز لے کر آیا، جو تمہارے نفسوں کو پسند نہیں تھی، تو تم نے اس کے ماننے سے تکبر کیا) (البقرۃ: ۸۷)

اسی طرح ہم نے بھی بعض وہ حصہ لے لیا، جو اپنے نفس کو پسند آیا، جس کے اندر آسانی نظر آئی، جس میں مفاد سمجھ میں آ گیا اور جو اپنے مزاج و نفس کے خلاف ہوا، جو اپنے مفاد کے خلاف تھا اور جو مشکل نظر آیا، اس کو ٹھکرا دیا۔

بھائیو! یادرکھو کہ اللہ کے دین کے بہت سے اجزا ہیں، عقائد ایک جزو ہے، عبادات ایک جزو ہے، اخلاقیات ایک جزو ہے، معاشرت ایک جزو ہے، معاملات ایک جزو ہے، اسی طرح سیاست بھی ایک جزو ہے، ان سارے ہی اجزا کو مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے " لِمَا یُحۡیِیۡکُمۡ" کے اندر رکھ دیا ہے؛ اس لیے یہاں کسی خاص چیز کا نام نہیں لیا گیا، "ما" عربی میں عموم کے لیے آتا ہے، جس کی طرف بھی اللہ اور اس کا رسول دعوت دے، اس میں ہماری حیات ہے، چاہے وہ شریعت کے ظاہری اجزا ہوں یا باطنی اجزا، اسی طرح وہ عقیدے وعبادات سے تعلق رکھنے والے ہوں یا معاملات سے متعلق ہوں، تعلیم وتہذیب سے ان کا تعلق ہو یا اخلاق سے ہو، یا کچھ اور، تمام قسم کی تعلیمات " لِمَا یُحۡیِیۡکُمۡ" کے اندر پوشیدہ ہیں؛ لہٰذا ان سب میں ہماری حیات ہے۔

ایک منافق کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ

ہم میں بہت سے لوگ ایسے ہیں، جو نماز روزہ و دیگر عبادات میں تو قرآن و حدیث پر عمل کرتے ہیں؛ لیکن جب مسئلہ مال و دولت کا اور اپنے ذاتی یا خاندانی مفادات کا آتا ہے، تو وہاں نہ اللہ یاد آتا ہے، نہ رسول کی پرواہ ہوتی ہے، نہ لوگوں ہی سے کوئی شرم وحیا ہوتی ہے؛ بل کہ سب سے بالاتر ہوکر وہ اپنے مفاد کے لیے کوشش کرتے ہیں، چاہے اللہ راضی ہو یا نہ ہو، اللہ کا رسول خوش ہو یا ناخوش ہو۔ یہاں مجھے وہ واقعہ یاد آتا ہے، جو ایک منافق و یہودی کے درمیان پیش آیا تھا، اس میں بھی وہی ہوا تھا کہ منافق نے اپنے مفاد کے لیے خدا کو دیکھا، نہ رسول اللہ کو، بس اسے تو اپنا مفاد پیارا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک منافق اور یہودی کے درمیان ایک زمین کے مسئلے میں

اختلاف و جھگڑا ہو گیا، یہودی کا کہنا تھا کہ یہ زمین میری ہے اور منافق کا دعویٰ تھا کہ میری ہے۔ یہودی نے کہا کہ تم مسلمان ہو، تو چلو تمہارے نبی کے پاس ہی فیصلہ کرا لیتے ہیں ؛ اب دونوں یہ مسئلہ لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں آئے اور اپنے مابین اس زمین کے متعلق فیصلہ طلب کرنے لگے، تو آپ ﷺ نے دونوں کی گفتگو سننے اور دونوں کے دلائل کا جائزہ لینے کے بعد یہودی کے حق میں فیصلہ کیا کہ یہ زمین یہودی کی ہے، اس مسلمان کی نہیں۔

آپ ﷺ کا یہ فیصلہ منافق کو پسند نہیں آیا۔ وہ یہودی سے کہنے لگا کہ یہ فیصلہ صحیح نہیں ہوا ؛ لہٰذا ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس اس کا دوبارہ فیصلہ کرائیں گے، اس پر بھی یہودی تیار ہو گیا۔ منافق دراصل یہ سمجھ رہا تھا کہ حضرت عمر چوں کہ کافروں، یہودیوں کے متعلق سخت ہیں، وہ اس یہودی کو برداشت نہیں کریں گے اور معاملہ سنتے ہی میرے حق میں فیصلہ کریں گے۔

چناں چہ دونوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پہنچے اور اپنے مسئلے کی تفصیل سنائی اور فیصلہ چاہا اور یہودی نے یہ بھی کہہ دیا کہ حضرت! اس کا فیصلہ آپ کے نبی میرے حق میں کر چکے ہیں ؛ مگر پھر بھی یہ مسلمان (منافق) ماننے کو تیار نہیں اور اس نے دوبارہ آپ سے فیصلہ کرانے کے لیے مجھے یہاں آپ کے پاس لایا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کیا حضور ﷺ نے فیصلہ کر دیا ہے؟ جواب دیا گیا کہ ہاں! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم لوگ یہیں بیٹھے رہو، میں ابھی آتا ہوں۔ یہ کہہ کر حضرت عمر اندر گئے اور تلوار لا کر اس منافق کی گردن اڑا دی اور فرمایا کہ جو آپ ﷺ کے فیصلے سے راضی نہ ہو، اس کے حق میں عمر کا فیصلہ یہی ہے۔

اس کے بعد منافقوں نے شور مچایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مسلمان کو قتل کر دیا، حضور کی خدمت میں شکایت لے کر آئے، اسی واقعے کے متعلق اس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ (النساء: ۶۵)

(پس آپ کے رب کی قسم ہے کہ وہ لوگ مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپ کو اپنے جھگڑوں میں حَکَم نہ مانیں اور آپ کے فیصلے سے اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں اور بلا چوں و چرا قبول نہ کرلیں) (تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۵۲۱)

معلوم ہوا کہ دین کی بعض باتوں کو ماننا اور بعض کا انکار کرنا، منافقوں کی علامت ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیدا ہوتے تو......

آج ہم شریعت کی کتنی باتوں کو نہیں مانتے؟ پھر بھی مسلمان کہلاتے ہیں، یہ اللہ کا احسان ہے کہ ہمیں اس زمانے میں پیدا کیا، "اگر صحابہ کے زمانے میں ہوتے، تو منافقوں میں شمار ہوتے" بعض لوگ کہتے ہیں کہ کاش ہم بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہوتے، تو کتنا اچھا تھا!!

حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ لوگ بے خبری میں یہ جملہ کہہ دیتے ہیں؛ لیکن میں اس کو سنتا ہوں، تو کانپ جاتا ہوں؛ اس لیے کہ اگر ہم لوگ اُس زمانے میں ہوتے، تو ہمارا حال بھی "ابو جہل"، "ابولہب" جیسا ہوتا، یہ اللہ نے بڑا کرم کیا کہ اس زمانے میں ہم کو رکھ دیا؛ لیکن اُس زمانے میں ہوتے، تو کوئی بات ہم نہ مانتے، ایک بھی بات نہ مانتے، تو سوچو کیا حال ہوتا؟ کتنی باتیں آج ہم رد کرتے ہیں

ظاہر میں باطن میں، حلال وحرام کے مسائل میں، تو پھر اس کا نتیجہ کیا ہوتا۔

اللہ ورسول کا ہر حکم ماننا ضروری-حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا قصہ

الغرض! دین کے تمام اجزا کو ماننا ضروری ہے، خواہ وہ کسی بھی معاملے سے متعلق ہو، حتیٰ کہ شادی بیاہ میں بھی، موت وغمی کے مسائل میں بھی۔

قرآن میں حضرت زینب بنت جحش وحضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کا ایک قصہ آیا ہے، جو اس سلسلے میں ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ایک آیت ہے:﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَامُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ﴾ (کسی مومن مرد وعورت کے لیے اس بات کی گنجائش نہیں ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول کا فیصلہ آجانے کے بعد اپنا اختیار استعمال کرے)

(الأحزاب: ٣٦)

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جب کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے نکاح کا مسئلہ درپیش تھا، حضرت زینب رضی اللہ عنہا اپنے علاقے میں انتہائی خوبصورت مانی جاتی تھیں، خاندان بھی اعلیٰ وارفع یعنی قریش کا۔اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان عرب میں سب سے اونچا خاندان تھا، اسی اثنا میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رشتہ بھیجا، وہ رشتہ کیا تھا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک منھ بولے بیٹے تھے، جن کا نام" حضرت زید بن حارثہ" تھا، یہی وہ زید ہیں، جن کا قرآن میں نام آیا ہے، ان کے سوا کسی اور صحابی کا نام قرآن میں نہیں ہے، اگر چہ کہ ان سے بڑے بڑے صحابہ ہیں، "حضرت ابوبکرؓ"، "حضرت عمرؓ"، "حضرت عثمانؓ"، "حضرت علیؓ" وغیرہ، مگر کسی

کا نام قرآن میں نہیں ہے ،صرف حضرت زید کا نام قرآن میں آیا ہے ، تو حضور ﷺ نے حضرت زینب کے لیے ان کا رشتہ بھیجا اور ان کے بھائیوں کو اس سلسلے میں متوجہ کیا۔

لیکن ان کے گھر والوں کو یہ رشتہ پسند نہیں آیا؛اس لیے کہ حضرت زید ایک : تو تھے غلام، جن کو حضور ﷺ نے آزاد کر دیا تھا ، دوسرے: یہ کہ ان کا کوئی خاص نسب نہیں تھا اور عرب میں نسب کا بہت اعتبار ہوتا تھا اور تیسرے: یہ کہ وہ کوئی بہت خوب صورت حسین وجمیل بھی نہیں تھے۔ان تینوں اعتبار سے حضرت زینب رضی اللہ عنہا ان سے بہت ہی اعلیٰ وارفع تھیں؛اس لیے ان کے خاندان والوں کو یہ رشتہ پسند نہ آیا اور تذبذب میں پڑ گئے کہ مانیں کہ نہ مانیں!!

اس وقت اللہ نے قرآن میں یہ آیت نازل فرمائی کہ کسی بھی معاملے میں چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں بھی چاہے وہ تمھاری عبادت سے متعلق ہو یا معاملات میں سے ہو،کسی بھی قسم کا معاملہ ہو،دین کا معاملہ ہو یا دنیا کا کوئی مسئلہ ہو،جب اس میں اللہ اور اللہ کے نبی کا کوئی حکم آجائے،تو کسی کو کوئی اختیار نہیں کہ اپنا بس چلائیں اور اپنی مرضی پر چلیں۔

دیکھیے ! یہاں شادی کا مسئلہ تھا، پسند ناپسند کا مسئلہ تھا،رسول اللہ ﷺ نے کہہ دیا کہ یہ رشتہ ہے،اس کو قبول کرو، دوسری جانب سے کچھ تذبذب کا معاملہ آ گیا، تو قرآن میں آیت نازل ہوگئی کہ اللہ کے رسول کی طرف سے ایک بات تجویز ہوا اور ان کی تجویز کو تم ٹھکرادو اور اپنی مرضی پر تم چلنا چاہو،تو اس کا مومن کو بالکل اختیار نہیں ہے۔

شادی میں دین کو مقدم رکھو!

ہوسکتا ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ سوال آئے کہ جب اللہ کے رسول موجود تھے،

اورآپ نے کوئی بات رشتے کی کہی، تواس کونہ ماننا تو واقعی جرم ہے؛ مگر جب آج اللہ کے رسول ہم میں نہیں ہیں، تو ہم پر کیا ذمے داری ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ کی شریعت میں جو احکام ہیں، ان کو ماننا ہمارے لیے ضروری ہے؛ خواہ وہ کسی بھی باب سے متعلق ہوں؛ شادی کے متعلق ہوں یا کاروبار کے متعلق ہوں یا کسی اور چیز کے بارے میں ہوں۔ مثلاً حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا انتخاب حسب ونسب، مال وزر اور حسن و جمال کی بنا پر نہیں؛ بل کہ دین کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "**تنکح المرأة لأربع :لمالها ولحسبها و لجمالها و لدينها ، فاظفر بذات الدين**"(عورت سے چار وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے:اس کے مال، اس کے نسب، اس کے جمال اور اس کے دین کی وجہ سے، تو دین والی کو اختیار کر کے کام یاب ہو جا) **(مشکوۃ: ۲۶۷)**

اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "عورت سے اس کے حسن کی بنا پر نکاح نہ کرو کہ ممکن ہے کہ اس کا حسن اس کو ہلاک کر دے اور اس کے مال کے لیے بھی اس سے نکاح نہ کرو، کہیں اس کا مال اس کو سرکشی پر نہ ابھار دے اور اس کے دین کی بنا پر اس سے نکاح کرو، پس ایک دین دار کالی کلوٹی باندی، بے دین حسین وجمیل عورت سے بہتر ہے۔

(سنن السعید:۱۲۵/۳)

غور کیجیے ان احادیث میں! ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا انتخاب مال و دولت، حسب ونسب، حُسن و جمال کی بنیاد پر نہیں کرنا چاہیے؛ بل کہ دین و دیانت،

تقویٰ و پرہیز گاری، ایمان و اسلام، اعمال و اخلاق کی بنیاد پر ہونا چاہیے اور یہ حکم جس طرح مردوں کو ہے، اسی طرح عورتوں کو بھی ہے کہ وہ اپنے لیے دین دار شوہر پسند کریں۔ اسی طرح مرد و عورت کے ذمہ داروں، سرپرستوں کو بھی اس کا حکم ہے کہ وہ اپنے لڑکے یا لڑکی کے لیے دین دار بیوی یا شوہر کا انتخاب کریں۔ اب اگر کوئی اس کے خلاف جمال کو یا مال کو نکاح میں معیار بناتا ہے، تو کیا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف چلنے والا نہیں؟

جوڑا جہیز کا مطالبہ

اسی طرح اور بھی چیزیں ہیں، میں یہاں نکاح میں ہونے والے تمام خرافات پر بحث کرنا نہیں چاہتا۔ دیکھیے! یہ حدیث تو بتا رہی ہے کہ نکاح کا مقصد مال و دولت نہیں ؛ بل کہ یہ ہونا چاہیے کہ عفت و عصمت حاصل ہو اور اس لیے رشتوں کے انتخاب میں دین داری کو مقدم رکھنا چاہیے؛ مگر کیا ہو رہا ہے؟ لوگ مال دولت سے اپنی حرص و لالچ کے پیٹ کو بھرنے کے لیے نکاح کرتے ہیں، مگر اس سے بھی ان کا یہ پیٹ بھرتا نہیں ؛ بل کہ حرص و لالچ کی آگ اور بھڑک جاتی ہے اور کبھی کبھی کیا؛ بل کہ بہت دفعہ یہ آگ بہت سی معصوم لڑکیوں کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ مگر اس پر بھی اس حریص و لالچی کو قرار نہیں آتا؛ بل کہ وہ دوسرے شکار کے لیے بے چین ہو کر تلاش شروع کر دیتا ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا:

''اگر آدمی کے پاس مال سے بھرے ہوئے دو جنگل ہوں، تب بھی وہ تیسرے کی تلاش کرے گا اور آدمی کے پیٹ کو سوائے (قبر کی) مٹی کے کوئی چیز نہیں بھرتی''

(مشکوٰۃ: ۴۵۰)

کیا اس سے بھی بڑا کوئی ظلم انسانیت پر ہو سکتا ہے؟ یہ سب کون ہیں جو کرتے

ہیں، ہم مسلمان ہی تو یہ سب کر رہے ہیں۔

یہ تو ایک دو باتیں مثال کے طور پر میں نے عرض کر دی ہیں، ورنہ تو شادی کا مسئلہ اس وقت قیامت بنا ہوا ہے؛ اس لیے شادی کو آج ہم قیامتِ صغریٰ کہیں، تو بجا ہے۔

ہماری معاشرت کی تباہیاں

اسی طرح ہماری معاشرت کی جو حالت ہے، وہ بھی سب کو معلوم ہے، کہ انتہائی بُری و تباہ کن ہو چکی ہے۔ کسی کا کوئی لحاظ و ادب تو ایک جانب، ہم تو لوگوں کے حقوق بھی نہیں جانتے۔ ماں باپ کا حق کیا ہے، رشتوں کے کیا حقوق ہیں، پڑوسیوں کا کیا حق بنتا ہے؟

افسوس!! آج ہماری معاشرت ایسی ہے کہ کسی کو کسی سے اطمینان و سکون میسر نہیں، اگر میاں، بیوی کے حقوق ادا کرتا ہے، تو بیوی اس کے حقوق ادا نہیں کرتی، اور اگر بیوی ادا کرتی ہے، تو شوہر ادا نہیں کرتا؛ پھر ہر ایک صرف اپنا حق مانگتا ہے، دوسرے کے حقوق کی کمی کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی۔ ایسی صورتِ حال میں آپسی جھگڑے و نزاعات کی فضا قائم نہ ہوگی، تو اور کیا ہوگا؟ اسی لیے آج طلاقوں کی بھرمار ہے، خلع کی بھرمار ہے، اگر زوجین میں سے ہر ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کی فکر کرے، تو سرے سے جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔

اسلامی معاشرت میں بڑوں کا ادب

اب ذرا یہ بھی تو دیکھیے کہ اسلام نے کس طرح کی حُسنِ معاشرت کی تعلیم دی ہے؟ اس کی چند جھلکیاں بھی دیکھتے چلیے۔ اسلامی معاشرت میں ایک چیز بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت بھی ہے۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی تعظیم وتوقیر نہ کرے، وہ ہم میں سے نہیں۔

(الأدب المفرد: ۷۵)

بڑوں کے ادب کا معاملہ خود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح کرتے تھے؟ اس کے بارے میں صحابی رسول حضرت ابوطفیل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے مقامِ ''جوانہ'' میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گوشت تقسیم کرتے ہوئے دیکھا، ناگہاں (اچانک) ایک عورت آئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہوگئی، آپ نے اپنی چادر اس عورت کے لیے بچھائی اور وہ اس پر بیٹھ گئی، حضرت ابوطفیل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون عورت ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ ماں ہیں، جنھوں نے آپ کو دودھ پلایا تھا۔ (مشکوٰۃ: ۴۲۰)

اسی طرح آپ نے دوسروں کو بھی اپنے بڑوں کا لحاظ کرنے کی تعلیم دی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے والد حضرت ابوقحافہ رضی اللہ عنہ فتحِ مکہ کے موقع پر ایمان لائے تھے اور کافی بڑی عمر کے آدمی تھے، ان کے ایمان لانے کا واقعہ کتبِ سیرت میں تفصیل سے آیا ہے، اس میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے والد کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور بتایا کہ یہ میرے والد ہیں اور ایمان قبول کرنے کے لیے آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر فرمایا کہ ابوبکر! آپ نے ان کو کیوں تکلیف دی؟ میں خود ان کے پاس چلا جاتا۔

(سیرۃ ابن ھشام: ۴۰۶/۲)

یہ ہے بڑوں کے بارے میں اسلام کی تعلیم اور ہمارا حال اس کے برعکس یہ ہے

کہ بڑوں کے نام سے چڑ ہے، ان کی نافرمانی ہے، ان کے ساتھ گستاخیاں ہیں۔

پڑوسیوں سے حُسنِ معاشرت

اسی طرح اسلام نے حسنِ معاشرت کی تعلیم دی، تو اس میں پڑوسیوں کے ساتھ سلوک و برتاؤ کا حکم دیا ہے؛ کیوں کہ پڑوس سے رابطہ وتعلق ہر آن ولمحہ برقرار رہتا ہے؛ اٹھتے بیٹھتے ان سے سابقہ پڑتا ہے؛ لہٰذا معاشرت میں لُطف وحسن پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پڑوسیوں کے ساتھ تعلقات کو بہتر سے بہتر بنایا جائے۔ قرآن پاک میں حکم دیا گیا ہے کہ "پڑوسیوں کے ساتھ احسان کرو" اور لفظِ احسان میں ہر بھلائی وخوبی نظر آجاتی ہے اور احادیث میں تو اس سلسلے میں نہایت سخت تاکیدی احکامات آئے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ خدا کی قسم وہ مومن نہیں، خدا کی قسم وہ مومن نہیں۔ آپ سے پوچھا گیا کہ کون یارسول اللہ؟ فرمایا کہ وہ، جس کی ایذاؤں اور تکلیفوں سے اس کا پڑوسی محفوظ نہیں ہے۔

(البخاري: ۲/ ۸۹)

اسی طرح آپ نے پڑوسی کی خبر گیری کرنے اور اس کا تعاون کرنے کا حکم دیا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ وہ مومن (کامل) نہیں ہوسکتا، جو خود پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا ہو۔

(الأدب المفرد: ۲۹)

غور کریں اس کا کیا مطلب ہے؟ مطلب یہ ہے کہ پڑوسی کی خبر گیری کرنا چاہیے اور اگر وہ بھوکا ہو، تو اپنے کھانے میں سے اس کو بھی دینا چاہیے، اگر کوئی ایسا نہیں کرتا اور خود سیراب ہوتا ہے، تو فرمایا کہ وہ کامل ایمان والا نہیں ہوسکتا۔

اسی لیے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو تعلیم دی ہے کہ اپنے سالن میں ذرا پانی زیادہ کرواور اپنے پڑوسیوں کو اس میں سے حصہ دو۔

(البخاری، ریا ض الصالحین: ۱۴۵)

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ معاشرت کا تاکیدی حکم شریعت نے دیا ہے کہ ان سے سلوک اچھا ہو، ایذا وتکلیف نہ پہنچائی جائے، ان کی خبر گیری کی جائے، اپنے کھانے میں سے ان کا بھی حصہ نکالا جائے، ضرورت پر اپنا دروازہ ان کے لیے بند نہ کرے۔

میں نے معاشرت کا ذکر ذرا وضاحت سے اس لیے کیا کہ لوگ اس کو اسلام کا جزو ہی نہیں سمجھتے؛ بل کہ لوگوں نے اس کو اسلام سے ہی خارج کر دیا ہے؛ اسلام سے ہی خارج کر دیا، تو اس پر عمل کیا خاک کریں گے؟ اس لیے اس میں بڑی ہی کوتاہی ہے۔

معاملات کی دنیا کی ابتری

اس کے بعد ذرا اس پر بھی نظر ڈال لو کہ ہمارے معاملات کا کیا حال ہے؟ لوگ اس کو بھی اسلام سے خارج سمجھتے ہیں؛ حالاں کہ یہ دین کا بہت اہم شعبہ ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ایک بزرگ'' حضرت یوسف بن اسباط رَحِمَہُ اللّٰہُ کہتے ہیں کہ جب کوئی جوان عبادت میں لگتا ہے، تو ابلیس (اپنی ذریت سے) کہتا ہے کہ دیکھو اس کا کھانا کیا ہے؟ اگر اس کا کھانا حرام ہوتا ہے، تو شیطان کہتا ہے کہ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو، اس کو نہ چھیڑو؛ تاکہ وہ مجاہدہ کرتا رہے اور تکلیف اُٹھاتا رہے؛ کیوں کہ وہ حرام کھانے کی وجہ سے خود ہی اپنی ہلاکت کے لیے کافی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حرام وحلال کی تمیز نہیں ہوتی، تو اس کی نیکیاں وعبادتیں بھی بے کار ہیں؛ اس لیے شیطان بھی اس کی عبادت کو کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں سمجھتا، تو

اللہ کے یہاں اس کا کیا اعتبار ہوگا؟

ایک اور بزرگ حضرت اسحاق الانصاری رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت حذیفہ مرعشی رحمۃ اللہ نے لوگوں کو صفِ اول کے لیے دوڑتے ہوئے دیکھا، تو فرمایا کہ مناسب ہوتا کہ یہ لوگ حلال کے حاصل کرنے کی طرف ایسا ہی دوڑتے۔

نیز حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ سے پوچھا گیا کہ صفِ اول کی فضیلت کیا ہے؟ فرمایا کہ تیری روٹی کا وہ ٹکڑا، جو تو کھاتا ہے اس کو دیکھ کہ یہ کہاں سے آیا ہے؟ پھر آخری صف ہی میں کھڑا ہو جانا۔

لہٰذا دین والے کو معاملات کی دنیا بھی صحیح کرنا چاہیے؛ مگر لوگوں نے اس کو دین سے خارج کر دیا اور اس وجہ سے اس میں من مانیاں کرتے ہیں، نہ حلال وحرام کی تمیز باقی رہی، نہ اچھے و بُرے کا کوئی فرق، نہ معاملات کی صفائی کا کوئی لحاظ رہا؛ حالاں کہ حرام سے پرہیز کرنا بھی اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے، ہم اس سے پرہیز کیے بغیر دین والے کیسے ہو سکتے ہیں؟

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "جو شخص حرام مال حاصل کرے گا اور اس سے صدقہ دے گا، تو وہ صدقہ قبول نہیں کیا جائے گا اور جو اس سے (اپنی ضرورت) میں خرچ کرے گا، اس میں برکت نہ ہوگی اور ترکے میں اس کو چھوڑ کر مرے گا، تو وہ اس کے لیے جہنم کا توشہ ہوگا"۔ (مشکوٰۃ : ۲۴۲)

یہ حدیث حرام مال کی دنیوی و اُخروی نحوست کو صاف و صریح انداز میں بتا رہی ہے۔ اخروی نحوست تو یہ ہے کہ صدقہ قبول نہ ہوگا اور یہ حرام مال، اس کا توشہ جہنم بنے گا اور دنیوی نحوست یہ ہے کہ اس مال کو خرچ کرے گا، تو اللہ تعالیٰ اس میں برکت نہ دے گا؛ چناں چہ مشاہدہ بھی ہے کہ حرام مال میں برکت نہیں ہوتی، وہ مقدار میں

زیادہ ہونے کے باوجود نفع نہیں دیتا، جو حلال مال دیتا ہے؛ چناں چہ آج لوگوں کے پاس مال تو بے حد ہے؛ مگر مال سے جو مقصود ہے یعنی راحت وسکون؛ وہ حاصل نہیں؛ بل کہ مال میں اضافے کے ساتھ ساتھ بے چینی میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے، یہی سب سے بڑی بے برکتی ہے۔ نیز ایک بے برکتی یہ بھی ہے کہ اس مال سے جو کام کرنا چاہتے ہیں، وہ ہوتے ہوتے رُک جاتا ہے اور کام ادھورا رہ جاتا ہے۔ نیز مالِ حرام استعمال کرنے والے کی دعائیں قبول نہیں کی جاتیں۔

چناں چہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "ایسا شخص، جو دور دراز سے سفر کر کے (کسی متبرک جگہ) آئے اس طرح کہ اس کے بال بکھرے ہوئے ہوں اور سر سے پاؤں تک وہ غبار میں اَٹا ہوا ہو اور وہ خوب گڑگڑا کر دعا کرے اور کہے: اے میرے رب! اے میرے رب! لیکن اس کا کھانا پینا حرام مال سے ہو، اس کا لباس حرام ہو اور اس کی پرورش حرام سے ہوئی ہو، تو اس حالت میں اس کی یہ دعا کیوں کر قبول ہوگی؟ (المسلم ۱۶۸۶، الترمذی ۲۹۱۵)

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی حرام سے احتیاط

ہمارے اسلاف کی زندگیوں میں حرام وحلال کی تمیز اور حرام سے بچنے کا کیا حال تھا؟ تاریخ وسیرت کی کتابیں دیکھنے سے اس کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ حضراتِ صحابہ اور سلفِ صالحین حرام چیزوں سے نہایت درجہ احتیاط کرتے تھے۔ میرا لکھا ہوا ایک رسالہ "تلاشِ حلال" میں اس سلسلے میں تفصیلات موجود ہیں۔

مثلاً: حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا واقعہ سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ حضرت کا ایک غلام تھا، وہ ایک دن کچھ کھانا لایا، حضرت نے اس میں سے ایک لقمہ کھا لیا، پھر آپ کو معلوم ہوا کہ یہ کھانا حرام کا ہے؛ کیوں کہ غلام نے بتایا کہ وہ

جاہلیت میں لوگوں کو غیب کی باتیں بتاتا تھا، یہ کھانا اسی کے عوض میں ملا ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تجھ پر تُف ہے؛ تو نے مجھے ہلاک کردیا۔ پھر آپ رضی اللہ عنہ نے منہ میں ہاتھ ڈال کر قے کرنا چاہا، مگر قے نہ ہوئی۔ لوگوں نے کہا پانی پینے سے قے ہوگی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے پانی منگوایا اور آپ پانی پیتے جاتے اور قے کرتے جاتے، یہاں تک کہ پورا کھانا نکل آیا۔

لوگوں نے کہا کہ اس ایک لقمے کے لیے آپ نے اتنی مشکل اٹھائی؟ فرمایا کہ اگر اس کے لیے میری جان بھی چلی جاتی، تو بھی میں ضرور اس کو نکالتا؛ کیوں کہ میں نے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ "جو جسم حرام سے پلا ہو، وہ دوزخ کے زیادہ لائق ہے"۔

اسی طرح ایک دفعہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں "بحرین" سے مُشک و عنبر آیا، آپ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ واللہ! میں چاہتا ہوں کہ کوئی اچھی طرح تولنے والی عورت ہو، جو اس مُشک و عنبر کو تولے؛ تاکہ میں اس کو مسلمانوں کے درمیان تقسیم کروں، یہ سن کر آپ کی زوجہ "حضرت عاتکہ بنت زید" نے عرض کیا کہ مجھے اچھی طرح تولنا آتا ہے، دیجیے میں تول دوں، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نہیں! انھوں نے پوچھا کہ کیوں؟ فرمایا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اس سے تم کچھ لے لو، اس طرح کہ تم اپنی گردن پوچھو اور اس کو یہ لگ جائے۔

ایک اور واقعہ سنیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کبھی کبھی اپنی بیوی کو بیت المال کا عطر (مشک و عنبر) دیتے، وہ اس کو فروخت کرتی تھیں، ضرورت پر اس کو اپنے دانتوں سے توڑتی تھیں اور اس میں سے کچھ ہاتھوں پر لگ جاتا، ایک دفعہ ایسا ہی ہوا تو، انھوں نے اپنے دوپٹہ سے پوچھ لیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ گھر آئے، تو فرمایا کہ یہ کیا

خوشبو ہے؟ ان کی زوجہ نے واقعہ بتایا، تو فرمایا کہ مسلمانوں کا عطر اور تم نے اس کو استعمال کر لیا؟ پھر ان کا دوپٹہ اتارا اور پانی سے دھوتے جاتے اور سونگتے جاتے تھے، جب تک وہ خوشبو رہی، برابر اس کو دھوتے رہے۔

ہماری دعا کیوں قبول نہیں ہوتی؟ - ایک واقعہ

بعض بل کہ اکثر لوگ سوال کرتے ہیں کہ ہم بڑی دعائیں کرتے ہیں، مگر برسہا برس ہو گئے، قبول نہیں ہوتیں، آخر ہماری دعا قبول کیوں نہیں ہوتی؟ حدیث نے اس کا جواب دے دیا کہ حرام غذا اور حرام لباس اختیار کرنے والوں کی دعا قبول نہیں کی جاتی، آج بہت سے مسلمان؛ بل لکہ نمازی، حاجی اور بڑی بڑی دینی خدمات میں لگے ہوئے لوگ حرام سے بچنے کا اہتمام نہیں کرتے؛ پھر کیوں کر دعا قبول ہوگی؟

ایک بزرگ کہیں جا رہے تھے، راستے میں ایک شخص نے نہایت اصرار سے ان سے عرض کیا کہ میرے ساتھ بیٹھ کر آپ کھانا کھائیں، بزرگ نے اس کی درخواست پر اس کے ساتھ کھانا کھالیا؛ پھر آگے چل پڑے، کچھ دور جانے کے بعد وہ اپنے راستے سے بھٹک گئے اور باوجود کوشش کے ان کو راستے کا علم نہ ہوسکا۔ بار بار اللہ سے دعا کی؛ مگر دعا قبول نہ ہوئی، بڑے پریشان ہوئے، جنگل کا بیابان راستہ، رات کا تاریک ماحول، وحشت ناک سناٹا، مگر راہیں بند ہیں، آخر کار ایک اور بزرگ کا ادھر سے گذر ہوا اور نھوں نے بتایا کہ تم نے جو کھانا فلاں آدمی کے ساتھ کھایا تھا، وہ حرام تھا؛ اس لیے تمہاری دعا قبول نہیں ہو رہی ہے، پہلے اس کی تلافی استغفار کے ذریعے کرو، تو پھر راستہ کھول دیا جائے گا؛ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ الغرض! دعا کی قبولیت کے لیے حرام سے بچنا لازم ہے، ورنہ دعا قبول نہیں ہوتی۔

میراث میں خیانت

بات آئی ہے، تو یہ بھی عرض کردوں کہ بہت سے نمازی و حاجی لوگ بھی اپنے والدین کی میراث میں صحیح تقسیم نہیں کرتے اور بعض لوگ اپنی بہنوں کا یا بھائیوں کا حصہ دبا لیتے ہیں۔ یہ بھی حرام ہے کہ میراث سے کسی وارث کو محروم کردیا جائے اور اس کا حصہ نہ دیا جائے اور اس پر خود قابض ہوجائے، آج کل یہ وبا بھی عام ہوتی جارہی ہے کہ ایک وارث سب مالِ میراث پر قابض ہوجاتا ہے اور دوسروں کو محروم کردیتا ہے اور بعض لوگ وارث بھی نہیں ہوتے اور وہ دوسروں کی جائے داد پر قبضہ کرلیتے ہیں اور وارثین کو محروم کردیتے ہیں اور بعض جگہ یہ رواج ہے کہ بھائی لوگ میراث کا کل مال لے لیتے ہیں اور اپنی بہنوں کو اس سے محروم کردیتے ہیں۔ یہ سب دین و دنیا دونوں کی ہلاکت کا سامان ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "مَنْ قَطَعَ مِيْرَاثًا فَرَضَهُ اللّٰهُ ، قَطَعَ اللّٰهُ مِيْرَاثَهُ مِنَ الْجَنَّةِ "(جس نے اللہ کے فرض کردہ کسی کی میراث کا حصہ کاٹ لیا اللہ تعالیٰ جنت کی میراث سے اس کا حصہ کاٹ دیں گے)

(شعب الإيمان: ۶/ ۲۲۴، سنن السعيد: ۱/ ۹۶)

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: "مَنْ أَبْطَلَ مِيْرَاثًا فَرَضَهُ اللّٰهُ فِيْ كِتَابِهِ أَبْطَلَ مِيْرَاثَهُ مِنَ الْجَنَّةِ "(جس نے کسی کی میراث، جو اللہ نے اپنی کتاب میں فرض کی ہے، اس کو باطل کرے گا، تو اللہ اس کی جنت کی میراث کو باطل کردے گا)

(مصنف ابن ابي شيبه: ۶/ ۲۴۰)

الغرض! میراث پر خود قابض ہوجانا اور وارثین کو اس سے محروم کردینا اور اس میں اللہ کے مقرر کردہ حصوں میں وارثین کی رضا کے بغیر کمی بیشی کرنا سب حرام و

ناجائز ہے۔ بہ ہر حال! دین سب شعبوں کا نام ہے؛ اس لیے ہمیں سب امورِ دین پر عمل کرنا چاہیے، صرف نماز پڑھ لینے کا نام دین نہیں، صرف حج پر حج کر لینے کا نام دین نہیں۔ آخر سوچیے کہ ان سب تعلیمات پر ہم عمل نہیں کریں گے، تو کون ان پر عمل کرے گا؟ اور اللہ و رسول کا کس سے مطالبہ ہے کہ ان پر عمل کرو، ہم بندوں ہی سے تو ہے؟ اور بالخصوص ان بندوں سے جو اس کے دین کو ماننے کا دعوے کرتے ہیں؛ لہٰذا اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

عبرت و نصیحت

دوستو! ایک بات یاد رکھو کہ جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بات کو ٹھکراؤ گے، تو ضرور کہیں نہ کہیں ٹھوکر کھاؤ گے، ٹھکرانے والے کو ٹھوکر ضرور لگے گی؛ اس لیے یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارا ہر طرزِ عمل اللہ اور اس کے رسول کے موافق ہو آج ہماری قوم، قومی اعتبار سے مردہ قوم ہے، اگر زندہ قوم کو دیکھنا چاہو، تو دیکھو حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کو، وہ تھے دراصل زندہ۔

''حیاۃ الصحابہ'' میں یہ واقعہ موجود ہے کہ ایک مرتبہ جہاد میں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم جارہے تھے، ایک علاقہ میں ''اللّٰہ أکبر'' کا نعرہ لگاتے ہیں، تو وہاں کے بادشاہ کے محل میں زلزلہ آجاتا ہے، صرف '' اللّٰہ اکبر ''کی صدا میں بادشاہ کے محل میں زلزلہ آگیا۔ آج کی اذان میں وہ طاقت نہیں، کیوں؟ وجہ وہی ہے کہ مردہ آواز میں طاقت نہیں ہوتی۔

اطباء لکھتے ہیں کہ جو انگور کی بیل قبرستان کی ہو اور اس سے شراب بنائی جائے، تو اس میں نشہ نہیں ہوتا؛ کیوں؟ اس لیے کہ مردہ زمین سے آئی ہے، جب مردہ زمین میں بوئے جانے والے ایک پھل کا یہ اثر ہو، تو جب ہم خود مردہ ہو جائیں، تو ہمارے

اندر کیا طاقت ہوگی۔

اس لیے آج اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے آپ کو زندہ بنانے کی فکر کریں اور ہماری زندگی اطاعتِ الٰہی اور اطاعتِ رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ میں پوشیدہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اطاعتِ الٰہی اور اطاعتِ رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی دولت عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔